پسِ پردۂ شب

حسین الحق

پسِ پردۂ شب

حسین الحق

جملہ حقوق بحق ایمائے حسین محفوظ

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

تعداد : ایک ہزار
صفحات : ۱۳۶
پہلا ایڈیشن : جنوری ۱۹۸۱ء
قیمت : بارہ روپئے
طباعت : تاج پریس - باری روڈ - گیا
سرورق : احمد سلیم

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ - جامعہ نگر - نئی دہلی
بک امپوریم - سبزی باغ - پٹنہ ۴
کلچرل اکاڈمی - رینا ہاؤس، جگ جیون روڈ - گیا
ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی - علی گڈھ
شب خون کتاب گھر - ۳۱۳ - رانی منڈی - الہ آباد
نیشنل اکادمی - ۹ - انصاری مارکیٹ - دریا گنج -
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

حسین الحق کے نام

جسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں

ناشر

قاضی علی حق اکیڈمی
آڈاری ہاؤس
شاہ ہارون
سہسرام

فہرست

	افسانے	صفحات
۱	سوانح حیات	۶
۲	چہرہ پس چہرہ	۱۱
۳	منظر کچھ یوں ہے	۲۲
۴	شاید	۲۷
۵	عکس عکس	۳۶
۶	شکستیدہ	۴۷
۷	مردہ آنکھوں کا زہر	۵۱
۸	پس پردۂ شب	۵۶
۹	منادی	۶۴
۱۰	لخت لخت	۷۱
۱۱	آدم کتھا	۸۳
۱۲	جال	۸۸
۱۳	وقنا عذاب النار	۹۲
۱۴	اندھی دشاؤں کے سائے	۹۷
۱۵	امرلتا	۱۰۶
۱۶	الیٰ حین	۱۱۳
۱۷	بلبلہ	۱۲۴
۱۸	صحرا کا سورج	۱۲۸
۱۹	سبا ویران	۱۳۴

سوانح حیات

اور جب میں علی امام کی سوانح حیات سن کر اس کے پاس سے اٹھا اور اپنے ہوسٹل کی طرف روانہ ہوا تو اسی لمحے سے ایک عجیب عمل یہ شروع ہوا کہ میرا قد چھوٹا ہونے لگا..... چھوٹا ہوتا گیا..... چھوٹا ہوتا گیا..... اور جب میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو مجھ سے پہلے ایک چھوٹا سا بچہ کمرے میں گھس گیا.....

وہ بچہ ہم لوگوں کا رشتہ دار تھا بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ ہم لوگ اس بچے کے رشتہ دار تھے کیونکہ اسی بچے کے گھر میں ہم لوگ رہتے تھے، یوں کہنے کو دیہات میں ہم لوگوں کو کئی قطعہ زمینیں اور مکانات تھے۔ مگر شہر میں آنے کے بعد مکان کا پرابلم اس طرح اٹھ کھڑا ہوا کہ ہم لوگ چار پانچ برسوں تک اس کے یہاں رہ گئے اور تب جا کر کہیں ہم لوگ اپنا ذاتی مکان بنا سکے۔

بہر کیف! میں اور وہ دونوں ایک ساتھ پڑھے اور بہت ساری باتوں کا شعور حاصل کیا اس لئے آج جب میں نے، امام کی سوانح حیات سنی

تو یہاں اور بہت ساری باتیں یاد آئیں وہیں وہ بچہ بھی یاد آگیا، سلسلوں کی یہ کڑیاں اپنے اندر وجودیت کی کتنی لہریں پوشیدہ کئے ہوئے ہیں یہ ایک الگ بحث ہے مگر اس قطرہ قطرہ دم توڑتی شب میں لمحوں کی وہ حیرانی فراموش نہیں کی جا سکتی جو اس زمانے میں ہم سب کا مقدر تھی اور اس زمانے میں ہم سب کا مقدر ہے، حیرانی کا یہ تسلسل بھی اپنے اندر عجیب طلسماتی فضا رکھتا ہے کہ سوچو تو تعجب ہو کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور جب جانو تو محسوس ہو کہ ایسا ہی تو ہونا چاہیئے تھا!

اور اب مجھے اُس بچے کی بعض باتیں یاد آرہی ہیں جو عجیب بھی ہوتی ہیں اور دلچسپ بھی مثلاً یہ کہ ایک مرتبہ کسی بچے نے اس کا سر پھوڑ دیا..... وہ روتا ہوا آیا، ہم لوگوں نے اسے چپ کرایا اور پھر جب اُس کے سر کو بینڈیج کر رہے تھے تو اچانک اس نے پوچھا کہ پاپا میرٹھ کہاں ہے؟

تو یہ حیرانی کا تسلسل ہی تھا جس نے اُس بچے کو بھی اس کا عادی بنا دیا کہ گھر کے کونے، کھدرے ذرے ذرے کا راز معلوم کرے اور پھر اُس کی یہ عادت بھی عجیب تھی کہ خواہشات کی تکمیل کے سلسلے میں انکار نہیں سن سکتا تھا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اس کو موٹر کے انجن کے اندر کی دنیا دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور پاپا کے پیچھے پڑ گیا کہ "موٹر کا اگلا حصہ اٹھائیے" اس کے پاپا نے اس کی ضد رکھنے کے لئے موٹر کا اگلا حصہ اٹھا دیا اور وہ تقریباً ایک گھنٹہ تک انجن پر ہاتھ صاف کرتا رہا اور ایک گھنٹے کے بعد یہ کہتا ہوا ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ "دھت کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے"۔

اور جب شام کو گھومنے کے لئے اپنے پاپا کے ساتھ وہ کار میں بیٹھا اور ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی تو کار گھوں گھوں کر کے رہ گئی، صاحبزادے تو دن ہی میں موٹر پر ہاتھ صاف کر چکے تھے اور کچھ پلّے نہ پڑا تھا مگر اب پھر ان کے دماغ میں خلش پیدا ہوئی کہ "موٹر چلتی کیوں نہیں؟"

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ ضدی تھا اور اپنی ہر خواہش ہر قیمت پر پوری

کرنا چاہتا تھا اور اس کے نتیجے میں اس کے پاپا نے اس کے لئے اس کے معیار کی ہر چیز منگا دی تھی، چاکلیٹ، بسکٹ، البم، اسٹامپ، موٹر، ریل، جہاز، کشتی گڈے، گیند، کرکٹ، ام غلم، کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس کے پاس موجود نہ ہو اور صرف موجود ہی نہیں کافی مقدار میں موجود رہتی تھی۔

اسی سلسلے میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ اس نے سڑک پر بیلون بکتے ہوئے دیکھا اور ڈھیر سارے بیلون خرید لئے اور گھر پہنچ کر پھلانا شروع کیا لیکن آئیڈیا تو تھا نہیں کہ کہاں تک پھلانا چاہئے اور کس حصے کے بعد پھلانا بند کر دینا چاہئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب پھلانا شروع کیا تو پھلاتا چلا گیا اور پھر ایک مقام ایسا آیا کہ بیلون بھڑام سے ہو کر رہ گیا۔

اس نے پھر دوسرا بیلون لیا اور پھلانا شروع کیا اس کا بھی وہی حشر ہوا۔

پھر تیسرا بیلون لیا اور پھلانا شروع کیا اس کا بھی وہی حشر ہوا۔

پھر چوتھا بیلون لیا اور پھلانا شروع کیا اس کا بھی وہی حشر ہوا۔

پھر پانچواں ..... پھر چھٹا ..... پھر ساتواں ..... پھر آٹھواں ..... پھر ..... پھر ..... پھر .....

ایک ایک کر کے سارے بیلون پھوٹ گئے۔

وہ جھلایا ہوا اور تقریباً دوڑتا ہوا بیلون والے کے پاس گیا۔

"اے! تم نے کیسے بیلون دیئے تھے؟ سب تو پھوٹ گئے!"

"پھوٹ گئے؟"

"ہاں سب پھوٹ گئے!"

"آپ نے زیادہ ہوا دے دی ہوگی، دیکھئے ایسے پھلائیے۔" بیلون والے نے بچے کو بیلون پھلا کر دکھایا۔

"اچھا، ایک اور دینا تو!"

اب کے اس نے ذرا سنبھل سنبھل کر، آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر پھلانا

شروع کیا۔ ایک خاص وقت تک بیلون والا بچے کو بیلون پھلاتے دیکھتا رہا اور ہدایات دیتا رہا مگر ایسی درمیان اور بچے آ گئے اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور ادھر بچہ بیلون پھلاتا گیا ...... پھلاتا گیا ...... اور ایک مرتبہ

بھڑام سے!

آواز اتنی زور دار اور غیر متوقع تھی کہ بچے ڈر کر اچھل پڑے، بیلون والے کے ہاتھ سے بیلون کا پٹارہ ہی چھوٹ گیا۔ کتنے بیلون ہوا میں اڑ گئے اور کتنے وہیں پر بھگدڑ کی وجہ سے پیروں سے دب کر بھڑام بھڑام کر کے پھوٹ گئے۔

بیلون والے کو ہنسی بھی آ رہی تھی اور غصہ بھی، وہ بہت دیر تک اس بچے کو عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اپنے پٹارے میں سے ایک بہت لمبا چوڑا اور موٹا سا بیلون نکال کر دیا۔

"لو اسے پھلاؤ ...... پھر نہیں آؤ گے"۔

بچے نے پیسہ دیا اور وہیں سے پھلاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ بیلون لمبا چوڑا بھی تھا اور دبیز بھی۔ عام بچے تو اس کو پھلا ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ منھ دکھ جاتا تھا لیکن اس میں اور عام بچے میں بہت فرق تھا، عام بچوں کو تو مرغن غذا در کنار سلیقے کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا اور اس بچے کے حالات کچھ یوں تھے کہ اسے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سبھی اس کو میسر تھیں۔ اس لیے اس نے پھلانا شروع کیا تو پھلاتا چلا گیا، پھلاتے پھلاتے آخر وہ بھی تھک گیا اور بیلون کی صورت عجیب سی ہو گئی۔ بالکل کدو کے جیسی گولائی اور لمبائی ایک بانس سے کم تو نہیں ہو گی۔ عجیب قسم کا بیلون تھا، ایسا بیلون اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

دوپہر کا وقت ہو چکا تھا اس لئے اس نے بیلون کو دھاگے سے کس کر باندھ دیا اور سوچا کہ کھانے کے بعد اس کے آگے سے پھلانا شروع کرے گا لیکن عجیب بات ہوئی کہ جب وہ کھانا کھا کر واپس آیا تو بیلون پھر اپنی پچھلی صورت

پر آچکا تھا، بچہ بہت جھلّایا اور سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا کہ "آخر بیلون کا دھاگا کس نے کھولا؟" مگر ہر گواہی اور شہادت نے اس کا ثبوت دیا کہ جب وہ کھانا کھانے آیا تو اس کے بعد سے اب تک کوئی اس کے کمرے میں گیا ہی نہیں

خیر! چیخ چلّا کر وہ دوبارہ اُس کو پُھلانے بیٹھا..... پھر پُھلاتے پُھلاتے رات ہوگئی تو اس نے بیلون کو کمرے میں رکھا، کمرے کے دروازے پر تالا لگایا اور اس کے بعد کھانا کھانے کے بعد کمرے میں آیا تو پھر اُس نے چیخنا چلّانا شروع کیا۔

بیلون پھر اپنی پچھلی حالت میں واپس آچکا تھا۔

چیخ چلّا کر اس نے پھر پھلانا شروع کیا..... پھلاتے پھلاتے رات کا ایک بج گیا تب اس کی ممّی اور پاپا نے زبردستی اس کو سلایا اور اس کے اطمینان کے لئے بیلون کو اس کے بکسے میں رکھ کر تالا لگا کر اور کنجی کی مالا بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔

مگر دوسری صبح وہ بچہ بھی کچھ خوفزدہ سا ہوگیا اور اس کی ممی پاپا بھی کچھ سوچنے لگے کیونکہ بیلون پھر اپنی پچھلی صورت اختیار کر چکا تھا۔

"بیٹے! پھینک دو اس بیلون کو دوسرا بیلون آجائے گا۔" اس کی ممّی نے اسے سمجھایا اور وہ بھی نہ جانے کیا سوچ کر مان گیا۔

"کلوا! لے جا۔ باہر کوڑے پر پھینک آ۔" اس کی ممّی نے نوکر سے بیلون کی طرف اشارہ کر کے کہا، وہ خود بھی شاید اس بیلون سے خوفزدہ ہوگئی تھیں۔

اور اب کہانی یہاں سے یہ موڑ لیتی ہے کہ کلوا جب بیلون کو گھورے پر ڈال رہا تھا تو ایک "فٹ" پاتھی بچے نے دیکھ لیا اور جب کلوا بہت دور چلا گیا تو آہستہ آہستہ وہ اس کے رنگ برنگے لباس پر نظر جمائے اس کے نزدیک آیا اور اس کو اٹھا کر اندھا دھند اپنے اڈے کی طرف بھاگا، اڈے پر اس کے

چند ساتھی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

"دیکھ بے دیکھ...... بیلون!"

اُس نے اپنے ساتھیوں کو دکھلا کر منھ سے لگا یا اور پھونکنا شروع کیا۔ پہلے اس کے دونوں گال پھولے، پھر آنکھیں کچھ بڑی ہو گئیں، پھر چہرہ پیلا ہوا، پھر سرخ ہوا، پھر اُجلا ہوا اور آخر بس جب آنکھیں حلقے سے باہر نکلنے لگیں تو گھبرا کر اس نے بیلون منھ سے نکال لیا۔

"امی سالا تو پھول ہی نہیں رہا۔"

"ابے لالا، ادھر دے، ہم پُھلا دیں ہیں۔" ایک دوسرے ساتھی نے اُس سے لے کر پُھلانا شروع کیا مگر اس کے ساتھ بھی وہی ساری کیفیتیں پیش آئیں۔

پھر تیسرے نے لیا۔

پھر چوتھے نے لیا۔

پھر پانچویں نے لیا۔

اور آخر ایک نے یہ کہہ کر پھینک دیا کہ "بھک کا جانے سالا کہاں سے اٹھا لایا ہے۔ سانس پھولنے لگی مگر ای سالا پھولبے نہیں کرتا ہے۔"

"سالے۔ پھولے گی نہیں۔ دم۔ رے! پمپ سے پُھلا نے والا سالے مُنھ سے پھلا رہے ہیں۔" ایک ساتھی نے جس نے بیلون کو پُھلانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، ہنستے ہوئے کہا۔

میں یہیں تک لکھ پایا تھا کہ وہ بچہ جو میرے کمرے کا دروازہ کھلتے ہی مجھ سے پہلے ہی کمرے میں گھس گیا تھا نہ جانے کہاں سے اُچک کر بیل پر میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور سرگوشیوں میں کہنے لگا۔

"سنو! میں بھی اپنے پاپا کا بہت پیارا ہوں اور میرے پاپا نے میری خواہش کے بغیر چھوٹا والا اور بڑا والا دونوں قسم کا بیلون ایک

ما تھو لا دیا، اور اب ہوتا یہ ہے کہ چھوٹا والا بیلون پھلاتا ہوں تو پھوٹ جاتا ہے اور بڑا والا لامتناہی سلسلوں کا آئینہ بن جاتا ہے ....
میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
میں نے اپنی نم آنکھیں خشک کرتے ہوئے سوچا کہ بیلون سے بچوں کا یہ شغف کب ختم ہوگا؟
کیسے ختم ہوگا؟
ختم ہو بھی سکے گا یا نہیں؟؟

چہرہ پس چہرہ

صبح سے طبیعت اور بھی اداس ہے۔

بار بار وہ تصویر نگاہوں کے سامنے جلتی ہے بجھتی ہے ...... جلتی ہے بجھتی ہے، اور میں سی فس اور نیرو کے بیچ کی چیز بنا اثبات اور نفی کے دھندلکو میں گھرا ہینڈ ولم بن کر رہ گیا ہوں۔

آتش دان میں آگ روشن ہے۔ میں نے تمام گرم کپڑے پہن رکھے ہیں تاکہ ۱۵ دسمبر سے ۱۵ جنوری کے درمیان کی اس شدید سردی کا مقابلہ کر سکوں جو کبھی کبھی وجود اور لا وجود کے احساس کو ہم آہنگ کر دیتی ہے۔

کئی بار سوچا کہ باہر نکلوں، آج اتوار ہے، دوستوں کو شکایتیں ہیں کہ میں ان کے یہاں نہیں جاتا۔ کئی بار اس ارادے سے اٹھا بھی لیکن پھر بیٹھ گیا۔

وجود کی اس ساری تفصیل میں یہ سب کچھ ایک نقطے کی طرح ہے لیکن ایسا ہی جیسے سات فٹ کے لمبے چوڑے آدمی کو سوئی چبھ جائے تو؟

کل فراز بتانے لگا "پاپا یہ جو ہمارے دائیں طرف جیا صاحب ہیں اور بائیں راجل صاحب اور بالکل سامنے شرما جی، یہ تینوں ایک

دوسرے کے حریف ہیں لیکن سامنے والے شرما جی نے دوہری پالیسی اختیار کر رکھی ہے، وہ راحیل صاحب سے بھی ملتے ہیں اور جبار صاحب سے بھی اور یہ دونوں ایک دوسرے کو زک دینے کے لئے شرما جی کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے فراز کو ابھرتی ڈوبتی نظروں سے دیکھا تو وہ گھبرا گیا۔ "کیوں پاپا؟ کیا بات ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"ارے نہیں، کوئی بات نہیں بیٹے۔" میں نے فراز کو ہنس کر ٹال دیا لیکن اس وقت سے من پر کچھ بوجھ سا ہے، سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے، لگتا ہے فضاؤں میں تیزابکاری کے اثرات اور پائیدار ہوتے جا رہے ہیں۔

اور آج شیمی نے یہ تصویر دکھا دی۔ دیکھئے دل کو کتنا اداس کر دینے والا آرٹ ہے!"

دل تو یوں بھی صدیوں سے اداس ہے، کائنات کے بھرے پڑے وجود کا وہ حصہ جہاں اداسیوں کا میلہ ہے، نہ کوئی شناسا، نہ دوست، نہ ہمراز، اس پاگل، وحشی، گونگی، بہری کائنات میں تیری کون سنتا ہے ..... اے دل ..... اے دل! "سازش، مکر اور فریب سے بھری ہوئی اس دنیا میں تم کہاں پہ ٹھہرے ہو..... اے پاگل آدمی! میں آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہوں، پھر چونکتا ہوں کہ ادھر اُدھر دیکھنے لگتا ہوں "کسی نے سن تو نہیں لیا؟"

میں پاس ہی پڑے ہوئے اس پرچے کو اٹھاتا ہوں جس میں وہ تصویر ہے، پھر رکھ دیتا ہوں ....."

دیکھنا کیا ہے؟ کیا ایکسرے رپورٹ کے بغیر مریض یہ نہیں جان سکتا

کہ اسے ٹی بی ہے یا کینسر؟

"پاپا یہ جو ہمارے دائیں طرف جواد صاحب ہیں ......"

میں سر جھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہوں، بیکار ہے، یہ سب کچھ بیکار ہے ...... عبث ...... مجھے اس سے کیا؟

لیکن اچانک پیروں کی طاقت جواب دے جاتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چھت میں لگا ہوا ساکت و جامد پنکھا اپنی پوری رفتار کے ساتھ گھوم رہا ہے ...... گردش میں ساری کائنات ہے ...... موجود بس ممات ہے ...... بس ممات ہے!

میں گھبرا کر پھر کرسی میں ڈھیر ہو جاتا ہوں، گردن میں چپچپاہٹ ہو رہی ہے، دسمبر کی اس کٹکٹاتی سردی میں بھی جی چاہتا ہے سب کپڑے اتار کر پھینک دوں مگر ہاتھوں میں طاقت ہو تب نا؟

اچانک اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی ایک چیخ .... میں پتھر کی طرح اپنی جگہ ساکت ...... پہاڑی کے دامن میں تین چار آدمی کسی ایک آدمی کو ذبح کر رہے تھے ...... اور اس اکیلے بےسہارا شخص ...... نہیں معصوم اور تنہا بچے ...... نہیں تنہا اور بےسہارا فاختہ کی اس ایک چیخ میں نہ جانے کیا تھا کہ پہاڑیاں ہزاروں لاکھوں آدمیوں ...... معصوم، تنہا اور بےسہارا فاختاؤں کی چیخوں سے گونج اٹھیں ......"

"بچاؤ ...... بچاؤ ...... بچاؤ ......"

"بچالو ...... بچالو اسے ...... بچالو" میں اس طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا؛ وہ چھرا لیے میری طرف دوڑا اور میں اس کو بچانے کی بجائے سرپٹ شہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا ...... بھاگتا رہا ...... بھاگتا رہا ...... ازل سے اسی طرح بھاگ رہا ہوں

.... ازل سے کوئی قتل ہو رہا ہے ...... اور میں بھاگ رہا ہوں ...."

"تو بھی ...... بزدل ..... کائر ...... کمینہ ......"

اس سارے خرابے میں میرا کتنا حصہ ہے؟ میری کیا حیثیت ہے؟ کیا معنی ہے میرے وجود کا؟ کیا مقصد ہے میری پیدائش کا؟

میں پسینے سے شرابور ہو رہا ہوں، ہمت کر کے اپنا اوور کوٹ اتارتا ہوں، کوٹ اتارتا ہوں، فل سوئٹر، سوئٹر، قمیص، بنیان، سارے کپڑے میں نے اتار کر پھینک دیئے ہیں، پھر بھی تپش اور جلن میرے وجود کو جلا کر راکھ کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔ میں کرسی اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوتا ہوں کہ پنکھا چلا دوں ...... الیکٹرک پوائنٹس کے پاس ہی طاق ہے ...... اور طاق پر بہت پرانا ...... ۶۷ء کا ...... رانچی سے آیا ہوا ایک خط ......"

"انھوں نے مکان کے دروازے پر تالا لگا کر مکان کے چاروں طرف پٹرول چھڑکا اور ایک جلتی ہوئی تیلی مکان پر پھینک دی ......"

بجیا آج بھی تمہارا آنسوؤں میں ڈوبا، تھکا ہارا، پریشان چہرہ روشن ہے۔ بھری پری شاہراہوں پر، دل جیسے تنہا اور ویران گوشے میں، صبح کے دھندلکوں میں، شام کے اندھیروں میں، سفر کے کٹھے کوس میں، خوشی کے لمحوں اور دکھ کے پل میں ...... تم ہر جگہ موجود ہو ...... تم چیخ رہی ہو ...... تم رو رہی ہو ...... تمہاری بیٹیاں تم سے چمٹی ہوئی ہیں ...... آگ کے شعلے تمہیں ریزہ ریزہ کر رہے ہیں ...... تم کھڑکی کھول کر دیکھتی ہو کہ تمہارا بھائی آیا یا نہیں ...... پھر بے تابی سے بیٹیوں کو بچانے دوڑتی ہو، پھر نہ خود بچتی ہو اور نہ تمہاری بیٹی ......"

میں پنکھا چلانا بھول جاتا ہوں، مجھے یاد آتا ہے کہ ادھر اوپر کی الماری میں ۶۵ء، ۶۷ء، ۷۰ء اور ۷۱ء کے اخبارات کی فائل ہے، اور اچانک

مجھے احساس ہوتا ہے جیسے میں ہونے کے باوجود نہیں ہوں ...... یا شاید ہو گیا ہوں

...... یا شاید کہیں نہیں ہوں !

میں کہاں ہوں ؟

کہیں نہیں ...... کہیں بھی نہیں !

میرا وجود ہی کیا ہے ؟ تو بھی ...... کائر ...... بزدل ...... کمینہ

.... آدمی !

میں پھر بیٹھ جاتا ہوں اور اب کے پرچہ اٹھائے بغیر وہ تصویر میری

نگاہوں کے سامنے جھلملانے لگتی ہے ۔

میں بار بار سر جھٹک کر اپنے آپ کو خالی الذہن کرنا چاہتا ہوں لیکن

وہ تصویر بڑی ہوتی ہے، اور پھر میرے پورے وجود پر چھا جاتی ہے ۔

ایک چھوٹی سی تصویر " ایک کتا زمین کے جس حصے پر بیٹھا ہوا ہے ،

اس حصے پر جھپٹتا ہوا ایک بھیڑیا، اور ان دونوں سے بہت دور حسرت سے

زمین کے اس حصے کو دیکھتی ہوئی ایک بلی ...... اور بلی کے پنجوں میں دبا ایک

مردہ خرگوش "

پس منظر میں دور دور تک اندھیرا سناٹا اور ہولناکی اور بھیڑیئے

کی آنکھوں میں درندگی، وحشت، اور حرص کی پرچھائیاں ...... اور کتے کی

آنکھوں میں خوف اور اعضا کی حرکت سے ایسا اظہار جیسے وہ خود کو بھی بچانا

چاہتا ہے اور زمین کے اس حصے کو بھی جس پر وہ آرام کر رہا ہے ...... اور بہت

دور بلی کی آنکھوں میں حسرت، بے بسی اور کمزوری کی جھلکیاں ...... اور اس کے

پنجوں میں دبا ہوا مردہ خرگوش کسی بھی کیفیت کے اظہار سے مجبور ...... بے حسی

کی علامت !

میں نے کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لی ہیں ......

شاید اب وہ تصویر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے..... مگر تصویر ویسے ہی فروزاں ہے ..... جھلا رہی ہے۔ ایک کتا، ایک بھیڑیا ایک بلی، ایک خرگوش ..... ایک کتا، ایک بھیڑیا، ایک بلی، ایک خرگوش .....

اور اچانک ۱۵ دسمبر سے ۵ جنوری کے بیچ کی تمام موسمیاتی کیفیات ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھر جاتی ہیں، تپش اور جلن اور شدید ہو گئی ہے، کمرے میں گھٹن اور امس بڑھتی جا رہی ہے ..... میں کسی طرح ہمت کر کے کھڑکی تک پہنچتا ہوں اور دروازہ کھول دیتا ہوں کہ کچھ تو ٹھنڈی ہوا آئے، مگر فوراً ہی ہڑبڑا کر بند بھی کر دیتا ہوں کہ باہر سورج آگ برسا رہا ہے، فضا میں چنگاریاں اڑ رہی ہیں، گرم ہوائیں ابھی ابھی میرے وجود کو راکھ کرنے کے لئے کمرے میں گھس آئی تھیں اور اب میں کسی طرح اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ....."

"خدا کی پناہ ..... کیسی شدید لو ہے!" اور دور تک سناٹا، ویرانی، سنسناتی ہوئی انگارہ صفت ہوائیں ..... الاماں ..... الاماں!

میں ابھی اپنی سانسیں درست بھی نہیں کر پایا تھا کہ میری بیوی بے تحاشہ میرے کمرے میں گھس آئی، وہ ہانپ رہی تھی ..... اور پریشان تھی!

"دیکھئے ..... وہ ..... وہ ..... جو چند مہتروں کی جھونپڑیاں ہیں"۔ وہ اپنی پریشان سانسوں کو قابو میں کرتی ہوئی بولی۔

"ہم لوگوں کے گھروں کے آس پاس ..... وہ سب جبار صاحب شرما جی اور راحیل صاحب اپنے آدمیوں کے ذریعے اٹھوا کر پھنکوا رہے تھے مہتروں کا اور ان کے بچوں کا رونا بلکنا دیکھ کر فراز بیچ میں آ گیا کہ جب تک ان کے رہنے کا دوسرا کوئی انتظام نہیں ہو جاتا انہیں یہیں رہنے دیجئے ..... لیکن وہ لوگ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں..... بات بڑھ رہی ہے

.... فراز اکیلا ہے .... آپ جائیے ...... پلیز جائیے .... جلدی جائیے" میری بیوی نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا اور میں سوچے سمجھے باہر کی طرف دوڑ پڑا، اور ابھی میں گھر سے باہر بھی نہیں نکلا تھا کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ تیز دوڑتی ہوئی آئی اور میری طرف میری قمیص بڑھاتی ہوئی بولی:
"تو یہ قمیص تو پہن لیجئے"، یہ کیا پاگل پن تھا کہ اس سردی میں سب کپڑے اتارے ہوئے تھے۔ میں قمیص پہنتے ہوئے باہر کی طرف دوڑا۔

باہر فضا بہت کشیدہ ہو چکی تھی...... فراز چیخ رہا تھا:"

دیکھتا ہوں کس میں ہمت ہے جو ان کو یہاں سے ہٹا لیے؟ آپ لوگ آپس میں تو ایک دوسرے کی گردن کاٹنے پر تلے رہتے ہیں لیکن کسی کو برباد کرنے کے لیے سب ایک ہو جاتے ہیں۔"

دوسری طرف قمر باجی، راحیل صاحب، جبار صاحب اور ان کے ڈھیر سارے اہلکار مرنے مارنے پہ تلے ہوئے تھے۔

"تمہارا دماغ خراب ہوا ہے ...... چلو.... گھر چلو" میں نے قریب پہنچ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

"پاپا مجھے چھوڑ دیجئے ...... مجھے چھوڑ دیجئے .... پلیز پاپا" فراز مچلنے لگا۔

"بدتمیزی مت کرو" میں نے ڈانٹا۔ "تمہیں کیا ضرورت ہے۔ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی"

وہ مچلتا رہا، بگڑتا رہا، اور میں کھینچتا ہوا اسے گھر لے آیا...... اور اس کی ماں نے اسے کمرے میں بند کر دیا۔

میں نے اپنے کمرے میں آ کر اس سمت کی کھڑکی کھولی جدھر سے یہ سارا منظر نظر آ جائے۔"

"نیچے مہتروں کے بچے اور ان کی عورتیں اپنے پھونس کے جھونپڑوں سے لپٹی ہوئی تھیں اور شرما جی راحیل صاحب اور جبار صاحب کے آدمی انھیں مار رہے تھے، کنارے پھینک رہے تھے، ان کے مکانوں کو برباد کر رہے تھے۔"

"مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"پاپا۔ یہ جو ہمارے دائیں طرف جبار صاحب ہیں ....."

میں سر جھٹک کر کھڑکی بند کر دیتا ہوں" بیکار ہے .....

سب کچھ بیکار ہے ..... عبث ..... مجھے اس سے کیا؟"

اور اچانک میرے پیروں کی طاقت جواب دے جاتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چھت میں لگا ہوا ساکت و جامد پنکھا اپنی پوری رفتار کے ساتھ گھوم رہا ہے ..... یہ زمین گھوم رہی ہے ..... آسمان گھوم رہا ہے۔

میں گھبرا کر پھر کرسی میں ڈھیر ہو جاتا ہوں اور کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو پھر وہی تصویر نگاہوں کے سامنے جھلملانے لگتی ہے، میں خالی الذہن ہونے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں لیکن تصویر روشن ہے ....."

"ایک کتا، ایک بھیڑیا، ایک بلی، ایک خرگوش ..... ایک کتا، ایک بھیڑیا، ایک بلی، ایک خرگوش ....."

اور تب میں آہستہ سے بڑبڑاتا ہوں۔ ایک جبار، راحیل شرما، ایک میں، ایک میرا بیٹا ..... اور ایک وہ غریب مہتر ....."

میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟

میں اٹھنا چاہتا ہوں۔ باہر جانا چاہتا ہوں، وہاں جہاں یہ سب کچھ

ہو رہا ہے، لیکن میرے پیروں کی طاقت جواب دے چکی ہے"۔

میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن میرے ہاتھ مفلوج ہو چکے ہیں"......

میں پکارنا چاہتا ہوں، کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن میری آواز بند ہو چکی ہے..."

میں گھبرا کر آنکھیں کھولتا ہوں ...... پھر بلا ارادہ ہڑبڑا کر بند کر لیتا ہوں ...... پھر کھولتا ہوں ......"

کھلی آنکھوں کے سامنے وہ سارے مناظر جو میرے وجود کا حصّہ بھی اور الگ بھی، میرے مسیحا بھی قاتل بھی ...... اور میرے اندر بند آنکھوں کے پس پردہ، دور دور تک اس تصویر کی خراش ...... اور ایک بے سہارا، تنہا معصوم جان کی چیخ، جس میں ہزاروں لاکھوں معصوم جانوں کی چیخیں پنہاں ...... اور رانچی جہاں کے میلے میں میری بہن کھو گئی ...... اور فرات کا بے بس خانوادہ، اور لبنان کا آخری فلسطینی کیمپ ...... اور میرٹھ اور محمد پور میں نالی کا پانی پیتے ہوئے بوڑھے اور بجبجاتی نالیوں میں چھپ کر جان بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بچے ...... اور مائی لائی، نوا کھالی اور جمشید پور میں مرتا ہوا ذکی انور ......"

میں اپنے کمرے میں تنہا، کرسی پر ...... پتھر کی طرح ساکت اور سمندر کی لہروں کی طرح مضطرب اور بے چین!

اور آہستہ آہستہ اترتی ہوئی شام ......"

اور دھند ......"

اور اندھیرا ......"

گہرا اندھیرا ......"

اتھاہ گہرا اندھیرا ......"

منظر کچھ یوں ہے

منظر کچھ یوں ہے :-

کلاسیکل ٹائپ کا اسٹیج ہے جس میں کلاسیک کے تمام نازک خطوط اور نقوش نمایاں ہیں، پس منظر میں خوبصورت بل کھاتی ندیاں، بھیل بھرنے اور چشمے، خوبصورت کوہستانی سلسلے، دامنِ کوہ میں ہرنوں کی لانچیں، اور ہرنوں کی رفتار کے مقابل ایک ازحد نازک، سبک اور دلکش اداس لڑکی کے صبا رفتار خرام کا عکس، ایک شاعر جو شاید اکتارہ، یا بینا یا ستار بجا رہا ہے، دور دور تک میرا کبیر اور جائسی کے نغموں کی بازگشت، دور بہت دور بدھ گیا میں درخت کے نیچے لاکیفیتی حالت میں گوتم محوِ استغراق، اُس سے فاصلے پر سرجو ندی کے ایک تٹ پر پتھر کا کنارہ پکڑ کر اوپر آنے کی کوشش کرتا ہوا ابوالمنصور محمد کمال الدین، ایک کنارے پر چشتی بزرگوں کی جدوجہد کے نقوش، کچھ اور پرے ہٹ کر سمندر کے کنارے اور ناریل کے درختوں کے تلے دور دیس

سے آنے والوں کے باعث خبر مقدمی اور احتجاجی اثرات اور پھر بالترتیب کچھ اس سے بھی زیادہ سخت حالات اور جد و جہد کی پرچھائیاں جو تین رنگوں والی تصویر کی آمد تک آکر آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں

سب کچھ واضح، کچھ دھندلا، کچھ روشن روشن، کچھ مدھم مدھم ....."

حاضرین کی صفوں کے بارے میں شاید ابھی سوچا نہیں گیا ہے یا شاید یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ یہ ڈرامہ دیکھنے والوں کے بغیر بھی دکھایا جائے گا کیونکہ اسٹیج کے آگے کرسی وغیرہ کا انتظام نہیں لیا گیا ہے، جہاں یہ اسٹیج تیار کیا گیا ہے۔ اُس کے چاروں طرف قناتیں گھیر دی گئی ہیں اور یوں گھیری گئی ہیں کہ داخلے کے تمام راستے مسدود ہیں۔ بعض بعض جگہوں پر جہاں کوئی چھوٹا سا بھی سوراخ باقی رہ گیا ہے اور کسی کے جھانکنے کا خدشہ ہے وہاں موٹے تازے مسٹنڈے قسم کے دو چار افراد نیل پلایا پلایا ڈنڈا لئے کھڑے ہیں، اگر کبھی غلطی سے کوئی اُن سوراخوں سے جھانک کر اندر ہونے والے ڈرامے کو دیکھنا چاہتا ہے تو باہر کھڑے یہ مسٹنڈے ڈنڈے مار کر انہیں بھگا دیتے ہیں

اسٹیج پر چھوٹے بڑے مکانات کا سلسلہ دور دور تک چلا گیا ہے جن میں سے ہر دروازے پر بڑے بڑے قفل پڑے ہیں اور باہر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر کوئی نہیں ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے، ہر مکان میں کچھ نہ کچھ افراد ضرور ہیں، بعض مکانات سے بعض بچے باہر آنا اور باہر بکنے والے مت نئے غباروں سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں لیکن اُن کے بزرگ دبی دبی آوازوں میں اُن کو اُن کے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، بچے مچلتے ہیں اور منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں لیکن بزرگوں کی کوشش یہی ہے کہ اُن کی آواز باہر نہ جائے، بعض مکانات میں کچھ افراد ساکت و جامد اونگھ رہے ہیں، بعض کے ہاتھ پشت پر ہیں اور منہ پر ٹیپ لگا دیا گیا ہے۔

اسٹیج پر سامنے ڈائرکٹر ایک اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور وہ لوگوں کو

ہدایت کرتا جا رہا ہے اور اُس کی ہدایت کے مطابق سارا اسٹیج تیار کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف کلاسیک کے نازک نقوش اور خطوط کو ڈائرکٹر کی ہدایت کے مطابق اور زیادہ حاوی کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دوسری طرف اسٹیج کی ظاہری حالت یہ بتا رہی ہے کہ ڈرامہ شاید البسٹریکٹ ہو یا شاید تھیٹر آف کروئلٹی کی پیش کش کی جائے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک ہو سکتا ہے لیکن ڈرامہ کلاسیک بہرحال نہیں ہے اور یہی بات اُن لوگوں کے لئے حیرت کا باعث ہے (جو مسٹنڈوں کے ڈنڈے کھا کر بھی اندر جھانکنے کی جرأت کر بیٹھے ہیں) کہ کلاسیکل پس منظر میں نیا ڈرامہ کیسے اسٹیج کیا جائے گا؟

اسٹیج پر جو کردار موجود ہیں، اُن کی آنکھوں پر اور منھ پر ٹیپ ہے، ایک ہاتھ پشت سے ملا کر باندھ دیا گیا ہے اور ایک آزاد ہے، کانوں میں روئی بھری ہوئی ہے اور پیروں میں ویسی زنجیریں ہیں جو خطرناک پاگلوں کے پیروں میں ہوتی ہے گویا چل سکتے ہیں دوڑ نہیں سکتے صرف اونچی کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈائرکٹر اور اُس کے دونوں طرف کھڑے مورچھل جھلنے والے دو افراد کی صورتِ حال اس سے کچھ مختلف ہے۔

"کچھ مختلف" ان معنوں میں کہ اِن دونوں کی گردنوں میں صرف رسّی بندھی ہوئی ہے جس کا ایک سرا ڈائرکٹر کے ہاتھ میں ہے اور جب جب یہ دونوں ذرا سست ہونے لگتے ہیں یا کسی دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ڈائرکٹر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رسّی کے سرے کو زور سے جھٹکا دیتا ہے اور پھر یہ دونوں چونک کر چاق و چوبند ہو جاتے ہیں اور مورچھل جھلنے لگتے ہیں۔

یوں تو یہ سب کچھ ڈائرکٹر ہی کی نگرانی میں ہو رہا ہے لیکن اسٹیج کے پیچھے بھی ایک اسٹیج ہے اور ان دونوں کے بیچ ایک ہلکا سا پردہ ہے، پردے کے اُس پار ایک شخص ہونٹوں میں سگار دبائے بیٹھا ہے اور اسٹیج کے اِس طرف .....

ٹھیک اُس کی سیدھ میں .... ڈائرکٹر!

ڈائرکٹر کرسی پر بائیں طرف تن کر بیٹھا ہے اور اُس کے پیروں کے پاس ایک ڈبہ ہے اور ڈبے کے ڈھکن کے اوپری سرے میں ایک رسّی بندھی ہوئی ہے جس کا دوسرا سرا پردے کے پیچھے بیٹھے سگار پیتے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ہے۔

ڈائرکٹر کی کرسی گھومنے والی ہے جس کو اگر ڈائرکٹر چاہے تو کسی طرف بھی گھما سکتا ہے لیکن جب جب ڈائرکٹر کرسی کو بائیں سمت سے ذرا بھی کسی دوسری طرف موڑنا چاہتا ہے تو اسٹیج کے پیچھے بیٹھا سگار پیتا ہوا شخص ڈائرکٹر کے پیروں کے پاس رکھے ڈبے کو اپنے ہاتھ میں پکڑے رسّی کے دوسرے سرے کے سہارے کھول دیتا ہے اور اُس ڈبے میں کلبلاتی ہوئی دیمکوں کی ایک فوج نکل کر ڈائرکٹر کے ہاتھوں اور پیروں سے چمٹ جاتی ہے اور تب تڑپ کر ڈائرکٹر پھر بائیں سمت تن کر بیٹھ جاتا ہے اور اسٹیج کے پیچھے بیٹھا ہوا آدمی کوئی مخصوص دُھن بجانے لگتا ہے جس کو سن کر ساری دیمکیں واپس اپنے ڈبوں میں چلی جاتی ہیں۔

تو اب بحیثیت مجموعی صورت حال یہ ہے کہ حاضرین کی کوئی صف نہیں ہے اور اسٹیج کا پس منظر کلا سیک ہے اور پیش منظر میں ہر گھر پر قفل پڑا ہے اور لوگوں کا منھ، ناک، کان، آنکھ، ہاتھ، پیر سب بِکا ہے اور ڈائرکٹر کلبلاتی ہوئی دیمکوں کے حملے کے خوف سے لرزیدہ اور اسٹیج کے پیچھے ایک اور اسٹیج جہاں ایک آدمی منھ میں سگار دبائے بیٹھا ہے اور وقتاً فوقتاً دیمکوں کو آزاد کر دیتا ہے اسٹیج پر جو لوگ ہیں اُن میں سے بعض کا ایک ہاتھ آزاد ہے اور وہ اس آزاد ہاتھ اور گھسٹتے قدموں سے کچھ سامان لا رہے ہیں اور لے جا رہے ہیں۔

اسٹیج کے چاروں طرف قناتیں گھری ہیں اور قنات کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں پر جہاں مسٹنڈے تیل پلایا، ڈنڈا لئے کھڑے ہیں اور

کسی کو اندر جھانکنے نہیں دیتے وہاں صورت حال یہ ہے کہ اگر کوئی ایک ڈنڈا کھا کر اندر کا حیرت ناک نظارہ دیکھ لیتا ہے تو وہ دوسرے کو دوسرا تیسرے کو اور تیسرا چوتھے کو ضرور خبر کرتا ہے اور اس طرح ڈنڈے کھا کھا کر اندر کا نظارہ کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور مارنے والوں کے ہاتھ بھی اب دکھنے لگے ہیں۔

اس سارے وقوعے میں سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کبھی ایسا لگتا ہے کہ ڈرامہ اب شروع ہونے والا ہے اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب تو سامان سمیٹ کر رخصت ہونے کی تیاری ہے۔

گویا بنیادی طور پر اس سلسلے میں تین رائیں ہیں:۔

ڈرامہ ختم ہو چکا۔

ڈرامہ جاری ہے۔

ڈرامہ اب شروع ہونے والا ہے۔

آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ——— ؟؟؟

شاید

یہاں میں ہوں ——

وہاں کیا ہے، اس کا پتہ نہیں۔

میرے چاروں طرف گہری سیاہ، پراسرار رات ہے..... دور.....
تا حدِ نظر...... رات ......

رات جو اپنے سینے میں سب کچھ چھپا لیتی ہے..... میرے پہلے کے
دکھ سکھ..... جانے انجانے بھاؤں کے سارے بھید۔

رات جو شبنم میں نہائی اور دھند میں بھیگی ہوئی ہے، میرے دل کی طرح
جہاں ستارے اوس اور کہرے کے دھندلکے میں کھو جاتے ہیں۔

یہاں میں ہوں اس گہری سیاہ، پراسرار رات کا ایک حصہ، میرے
من میں بھی وہی دکھ، وہی اندھیرا، وہی اسرار، چاروں طرف بیتابانہ بھٹک رہا
ہوں...... کہیں کوئی نشان..... کوئی سراغ......

کہیں کچھ نہیں..... کچھ نہیں..... کچھ نہیں!

میں آہستہ سے اپنا سر ہلاتا ہوں، اطمینان کی سانس لیتا ہوں کہ ابھی

بھی احساس اپنے وجود کا ایک حصّہ ہے

پیروں کی لرزش پہ لہریں شاید مضطرب ہوگئی ہیں مجھے ایسا احساس ہو رہا ہے!

ساحل پر میں ہوں ..... اور ریت ..... اور ہوا ..... اور رات ..... گہری سیاہ پراسرار رات' ایک تیز رفتار ندی ..... دور تا حدِ نظر.... پانی اور رات' اور ہوا اور ریت ..... میرے قدموں کے نیچے ریت میرے پیچھے ریت ..... ساحلی ریت ..... اور اُس کے پیچھے ایک شہر' جو میرا ہے یا شاید میرا نہیں مگر جہاں میں رہتا ہوں' میرے آگے ..... ندی ..... تیز رفتار ندی پیر لٹکائے' بیٹھا ہوا میں' اور ندی کے اس کنارے..... شاید ریت' اور ہوا اور رات ..... گہری' سیاہ' پراسرار رات ..... اور اس کے آگے ایک شہر جو اس کا ہے یا شاید اس کا نہیں ہے مگر جہاں وہ رہتا ہے.....

ندی آہستہ آہستہ بہہ رہی ہے..... لہریں کنارے سے ٹکراتی ہیں' آواز پیدا ہوتی ہے ..... چپ ..... چپ ..... چپ' پھر وہ لہر آگے بڑھ جاتی ہے..... پھر دوسری لہر پھر تیسری لہر..... چپ ..... چپ ..... چپ .....

ایک تسلسل ..... مسلسل رواں دواں!

تسلسل! اندھیرے کا' اور لہروں کا' اور اسرار کا۔

تم کہاں ہو؟ اس سارے تسلسل میں تم کہاں پہ ٹھہرے ہو..... کہاں پہ رواں ہو؟

میں یہاں اس کنارے پر' رات' اور رات کے اسرار میں ہوں.....

اور رات آہستہ آہستہ بہہ رہی ہے' پانیوں کے اوپر' اور پانیوں کے اندر ..... ندی کے سینے پر رات ..... اور چراغ ..... ہولے ہولے بہتا ہوا چراغ! اس کنارے سے ہواؤں کے ریلے کے ساتھ شور و غل کی آوازیں یہاں تک پہنچ رہی ہیں.....

کچھ بھی واضح نہیں ..... سب دھندلا اور کہرا اور اسرار میں کھویا ہوا .... میں
دور سے آتی ہوئی آوازوں کو اپنے وجود کے ایک ایک حصے پر محسوس کر رہا
ہوں ..... بھاگتے ہوئے خوف زدہ قدم ..... گولیوں کی تڑتڑاہٹ ..... بچوں کی
سسکیاں اور بلبلاہٹ ..... تلواروں کی جھنکار ..... عورتوں کی بے سہارا
ہانپتی سانسیں .....

سنو! جب تمہاری نرم مٹی تمہارا بستر بنے تو یاد رکھنا کہ کہیں اور .....
کوئی اور بھی اس سارے تماشے میں شامل ہے میں! اس رات' اور اس رات
کے سارے اسرار کا ایک جزو ہوں ..... گہری سیاہ' پراسرار رات .....
ایک تیز رفتار ندی ..... دو تا حدِ نظر ..... پانی اور رات اور اس رات
کے سینے پر ایک چراغ ..... تیرتا ہوا چراغ ..... سمتوں کے تعین
سے بے پروا ..... لہروں پہ ہچکولے کھاتا ہوا چراغ ....

وہ اگر نہ آیا تو؟

میرے چاروں طرف رات ..... پہاں ہیں ..... اور ندی
..... ندی میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوا ہوں .....
کسی کا منتظر ..... انتظار کس کا ہے ..... جواب بھی اس
رات کی طرح اسرار میں گم ..... میں بار بار اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں ..
..... انتظار کس کا ہے ..... انتظار کس کا ہے' شاید اس کا .....
شاید اپنا ..... شاید تمہارا ..... شاید کسی کا نہیں .....

وہ اگر نہ آیا تو؟

ندی کے سینے پر تیرتا ہوا چراغ ..... سمتوں کے تعین سے
بے پروا ..... لہروں پہ ہچکولے کھاتا ہوا چراغ .....
الاؤ جل رہا ہے ..... آگ زندہ ہے .....
تو ایسا ..... تو ایسے ہوا ....."

ہاں کیا ہوا؟

میں کنارے سے ایک کنکری اٹھا کر ندی کے سینے پر مارتا ہوں لہریں مضطرب ..... تسلسل تیز ..... اور تیز ..... اور تیز .....

کڑے کوس کی یہ مسافت اور مسافر کو نیند آگئی۔

چراغ کا رخ کدھر ہے؟

میں پھر ایک کنکری ندی کے سینے پر مارتا ہوں ..... پھر مارتا ہوں ..... پھر مارتا ہوں .....

سب مسافر رستے میں کھو جاتے ہیں۔

چراغ کا رخ کدھر ہے۔

ندی کے اس کنارے پر میں ..... اس کنارے پر وہ یا اُس کنارے پر میں ..... اس کنارے پر وہ!

ہواؤں کے ریلے کے ساتھ تلوار کی جھنکار ..... بھاگتے ہوئے خوف زدہ قدم ..... گولیوں کی تڑتڑ تڑتڑ ..... بچوں کی سسکی ..... عورتوں کی بے سہارا ہانپتی سانسیں .....

تو ایسا ہوا کہ جب رات دھند میں کھو گئی تو کچھ ہیولے بگولے کی طرح رقصاں، شہر شہر وارد ہوئے، اور شہر سے باہر اس مقام پر جہاں اندر باہر کی ہواؤں کا آوان پروان ہوتا تھا، جمع ہوئے، سازشی حردث ترتیب دیئے گئے۔ پھر دن کی کھلی چمچماتی دھوپ میں سروں پر عذاب برسے۔

تو اے رستے میں سو جانے والے مسافر! شبنم تیری لحد کے پھولوں کو تازگی بخشے۔

نیل کے ساحل سے کاشغر کے کناروں تک ..... فرات اور جیحون اور گنگا، اور کوسی۔ اور جمنا، اور گنڈک اور سرسوتی اور مس سیپی اور ایمزن اور وانگا .....

سارے میں رات اور اس کے اسرار .... دور .... تا حد نظر ہوا، پانی اور رات ...... اور چاروں طرف بکھرے ہوئے انجانے اسرار ..... اور تیز رفتار ندی ...... اور ندی کے سینے پر ایک چراغ ...... تیرتا ہوا چراغ ...... سمتوں کے تعین سے بے پروا، لہروں پہ ہچکولے کھاتا ہوا چراغ۔

میں اس سارے سلسلے میں کہاں ہوں ...... شاید کہیں نہیں ..... شاید ہر جگہ!

تو یہ ہوا کہ اس کے بچوں کو اس کے سامنے نیزوں پر نچایا گیا، حالانکہ وہ بے قصور تھا۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کہ وہ اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جہاں لوگ کرسیوں پر نہیں بیٹھتے تھے

سارے میں پھیلی ہوئی اس داستان کا سرا کہاں نہیں ہے .... کہیں نہیں ہے!

ہوا کے ریلے کے ساتھ ...... صدیوں سے صدیوں کی صدیوں پر حاوی آوازیں ......"

آگ، کیل، ادھڑی، جلتی تپتی ریگ، نیزوں پر سر بلند، آگ کی زد پہ ہر اک گھر روشن، تلوار کی جھنکار، بھاگتے ہوئے خوف زدہ قدم، گولیوں کی تڑتڑ، بچوں کی سسکی، عورتوں کی بے سہارا ہانپتی آوازیں ......"

میں نے سب کچھ تو سہن کر لیا۔ اب کیا باقی ہے؟

میرے اندر ستارے اوس اور کہر کے دھندلکے میں کھوتے جا رہے ہیں اور میرے باہر چاروں طرف سسکیاں لیتی ہوئی رات بکھری پڑی ہے۔

وہ اگر نہیں آیا تو؟

ندی کے سینے پہ چراغ ہچکولے کھا رہا ہے

تو کب تک مجھے دھوکے میں رکھو گے؟ سب آ چکے ...... آنے والی ہر ٹرین، اور ہر بس سے کوئی نہ کوئی ضرور اترا ہے۔ کوئی چہرے پر نقاب ڈالے

ہوئے، کوئی چہرے کا کچھ حصہ رومال سے چھپائے ہوئے، کوئی برقع اوڑھے ہوئے
کوئی فیلٹ ہیٹ چہرے پہ جھکائے، دبیز سیاہ شیشے کا چشمہ لگائے، سب
اُترے، سب اترتے ہیں۔ ہاتھوں میں جھنڈیاں ..... ہونٹوں پہ انکار،
اقرار، اعتراف اور نفاق کی سازشی ترتیب .....

تم کہاں ہو؟ اس سارے تسلسل میں تم کہاں پہ ٹھہرے ہو؟ کہاں
پہ رواں ہو؟

تم اگر نہیں آئے ہو تو؟

وہ اگر نہیں آیا تو؟

میں صدیوں سے یہاں خموش ٹھہرا ہوا ہوں ..... صدیوں سے بہہ
رہا ہوں ..... صدیاں سے کہیں نہیں ہوں، صدیوں سے جہاں بھی ہوں،
میرے چاروں طرف رات ہے۔ اور اس کے اسرار ..... اور ندی کے سینے پہ
ہولے ہولے تیرتا ہوا چراغ ..... صدیوں سے یہی رات ..... گہری، سیاہ،
پراسرار رات .....

ہوا ..... ریت ..... پانی ..... اور رات ..... اور
اس تسلسل میں ..... میں ..... ایک نقطہ ..... یا شاید .....
سارے پہ حاوی ..... میں ..... ٹھہرا ہوا میں ..... بہتا ہوا میں ....

تالاب، ندی، دریا، سمندر!

سمندر، دریا، ندی، تالاب!

گہری، سیاہ، پراسرار رات، ..... ایک تیز رفتار ندی .....
ندی کے اس کنارے پہ میں ..... اُس کنارے پہ وہ ..... اس
کنارے پہ میں ..... اس کنارے پہ وہ!

وہ یہاں ہے؟

میں کہاں ہوں؟

شاید کہیں نہیں ..... شاید ہر جگہ!

لے ڈوبا یہ دھندلکا ..... کچھ صاف نہیں ..... کچھ واضح نہیں .... کہاں ..... کہاں ڈھونڈوں خود کو ..... وہ ہے بھی یا نہیں۔ کیا پتا وہ آہی گیا ہو!

ہواؤں کے ریلے کے ساتھ آتی ہوئی آوازیں ..... صدیوں کی صدیوں سے صدیوں پر حاوی آوازیں ....."

ان میں بھلا وہ کہاں ہوگا؟

ان میں بھلا وہ کیوں ہوگا؟

مجھ پہ کپکپی طاری ہو رہی ہے ..... آنے والے تو سب ساز و سامان کے ساتھ آئے ہیں ..... اُسے تو ننگے پیر ننگے سر اور کھلی مٹھیاں لیکر یہاں وارد ہونا ہے .....

نقابوں نے کب چارہ گری کی ہے ..... تمہیں کس بات کا ڈر ہے ..... وہ کیوں خوف زدہ ہے!

اُسے تو کسی خول کی ضرورت نہیں ..... وہ ان میں بھلا کیوں ہوگا

سنا! اُس طرف ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے پائے گئے۔

مجھے وجود اور عدم کا فرق مت بتاؤ ..... کیسا کیسا تڑپا ہوگا وہ ..... سمندروں سے گہری آنکھوں نے کیا کیا دیکھا ہوگا ..... تمہیں تو یہاں تک پہنچنا تھا ..... وہاں تک جانا تھا ..... جلتے تپتے اُس صحرا میں تم کہاں کھو گئے؟ مسافر کو رستے میں نیند آگئی ..... منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی .....

اے لالۂ صحرائی!

ندی پہ تیرتا ہوا چراغ ڈگمگ ڈگمگ کر رہا ہے۔

وہ اگر نہیں آیا تو؟

میرے چاروں طرف رات ہے۔ گہری، سیاہ، پُراسرار رات، اور رات کے اسرار.....

تم بھی کبھی اسرار میں کھو جاتے ہو، کبھی احساس میں ڈھل جاتے ہو، کبھی ہونٹوں پہ بکھر جاتے ہو!

"اس سمت ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے ....."

کیسا ریت پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ادھر دیکھا ہوگا!

"سمندر سے گہری آنکھیں..... کہاں کہاں روئی ہوں گی ....."

دھجی دھجی سب کچھ ..... ٹکڑے ٹکڑے وہ .....

اس سمت ..... ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے ..... ڈھانچے.... ڈھانچے .....

اُسے تو ننگے سر، ننگے پاؤں اور کھلی مٹھیاں لے کر وار دہوتا ہے!

وہ اسے کہاں کہاں قید کر سکیں گے!

تو سارے میں گہری، سیاہ پراسرار رات بکھری پڑی ہے، یہاں میں ہوں، اس گہری سیاہ پُراسرار رات کا حصہ، میرے من میں بھی وہ دکھ، وہی اسرار ..... چاروں طرف بیتابانہ بکھر رہا ہوں .....

کہیں کچھ نہیں ..... کچھ نہیں ..... کچھ نہیں .....

میرے چاروں طرف ہوا، پانی، رات، میرے پیچھے ایک شہر جو میرا ہے یا شاید میرا نہیں ہے مگر جہاں میں رہتا ہوں۔ میرے آگے ندی ..... ندی کے اُس کنارے ہو، پانی اور ریت ..... ساحلی ریت ..... اور اُس کے آگے ایک شہر جو اُس کا ہے یا شاید اُس کا نہیں ہے مگر جہاں وہ رہتا ہے۔

ندی آہستہ آہستہ بہہ رہی ہے ..... لہریں کناروں سے ٹکراتی ہیں

آواز پیدا ہوتی ہے ..... چپ ..... چپ ..... چپ ..... پھر وہ لہر
آگے بڑھ جاتی ہے ..... پھر دوسری لہر ..... پھر تیسری لہر ..... چپ .....
چپ ..... چپ .....

ایک تسلسل! مسلسل رواں دواں
تسلسل! اندھیرے کا، اور لہروں کا، اور اسرار کا .....
تم کہاں ہو؟ اس سارے تسلسل میں تم کہاں پہ ٹھہرے ہو؟ کہاں
پہ رواں ہو؟
ندی کے سینے پہ چراغ کبھی ڈگمگا تا ہے، کبھی لرزتا ہے، کبھی ہچکولے
کھاتا ہے۔

اس سارے خرابے میں میں کہاں ہوں؟ تم کہاں ہو؟
کیا یہاں تم ہو؟ کیا وہاں میں ہوں؟
کچھ واضح نہیں ..... سب دھند ..... کہر ..... اندھیرا اسرار
..... کچھ ہاں ..... کچھ نہیں ..... جانے کیا ہے ..... کیا نہیں ....
شاید ..... بس اک رات! جو شبنم میں نہائی اور دھند میں
بھیگی ہوئی ہے۔

اک مرا دل، جہاں ستارے، اوس اور کہر کی دھند میں کھوتے
جا رہے ہیں .....
اک چراغ! جو ندی کے سینے پر کبھی ڈگمگاتا ہے، کبھی لرزتا ہے
کبھی ہچکولے کھاتا ہے ....."

شاید یہ بھی نہیں ..... شاید وہ بھی نہیں .....
شاید سب کچھ ..... شاید کچھ بھی نہیں .....
شاید ..... شاید .....

عکس عکس

میں شیشے کے مکان میں قید ہوں اور سہسرام سے آیا ہوا خط بار بار میری نظروں کے سامنے جلتا ہے... بجھتا ہے... جلتا ہے... بجھتا ہے... شیشوں پہ اُجالوں اور اندھیروں کے عکس ہیں، سائے اُبھرتے ہیں، ڈوبتے ہیں، پرچھائیاں آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں اور یوں سحر زدہ فضاؤں میں گھرے ہوئے یہ لمحے کٹ رہے ہیں۔

باہر دُور دُور تک بارش بکھری ہوئی ہے۔ درختوں پر، درختوں کے پتّوں پر، اور شاخوں پر اور بارش کی دُھند میں کھوئے ہوئے مکانات پر اور شاہراہوں پر اور ستوں کے دونوں طرف ایستادہ بجلی کے کھمبوں پر، سالے میں بارش کے قطرے چمک رہے ہیں اور دُھند میں آہستہ آہستہ سب کچھ کھوتا جا رہا ہے۔

میرے اندر بھی صدیوں سے دُھند چھائی ہوئی ہے۔ آج تک کچھ بھی واضح نہ ہو پایا، کوئی چہرہ، کوئی شبیہہ، کوئی نقشِ پا، سب... کچھ روشن، کچھ مدھم اور میں اس بھری پُری کائنات کا ایک حصہ بن کر بھی کچھ اس سے الگ، کچھ اس سے متصل،

آشو پوچھتے ہیں "کائنات تمھیں رہ رہ کے کیا ہو جاتا ہے؟"

میں کیا جواب دوں کہ میرے من میں تو چوبیس گھنٹے اندھیرا رہتا ہے اور اس اندھیرے میں میں پُرسکون رہتی ہوں۔ سب کچھ غائب، نامعلوم، مگر چند لمحے، چند جان لیوا لمحے ایسے بھی نکل آتے ہیں جب من میں کچھ ستارے جھلملانے لگتے ہیں۔ کچھ سائے، کچھ شبیہیں، ایسا کچھ، جو جانا بوجھا بھی ہو اور انجانا بھی، اور تب اس لمحے میں آشو مجھ سے پوچھتے ہیں "کائنات تمھیں رہ رہ کے کیا ہو جاتا ہے؟"

میں انھیں کیا بتاؤں کہ ان کیفیتوں سے تو میں خود بھی واقف نہیں۔ بے نام احساس، انجانی کیفیت، قاتل لمحہ جس میں جی چاہتا ہے کہ یہ جو کچھ سامنے ہے، یہ کچھ بھی نہ رہے۔ یہ ایرکنڈیشنڈ کمرہ، یہ ریفریجریٹر، یہ ریڈیوگرام، یہ آرام دہ پلنگ، یہ سب کچھ فضا میں یوں اُڑ جائے جیسے روئی کے گالے، اور ان کی جگہ... ان کی جگہ میں کیا چاہتی ہوں... مجھے کیا چاہنا چاہیئے، مجھے نہیں معلوم، میں تو بس اک سحر کی اسیر ہوں... نظر بند... شیش محل میں... اندھیرے اُجالے کے اس چکر میں میری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیا ہے۔ میرا قصور کیا ہے؟ یہی نا، کہ میں سوچتی ہوں، سوچنے پر مجبور ہوں، میں دیکھتی ہوں، دیکھنے پر مجبور ہوں، میں محسوس کرتی ہوں، محسوس کرنے پر مجبور ہوں... اس مجبوری کا کیا علاج ہے؟ شاید کچھ بھی نہیں، شاید بہت کچھ، صحیح کیا ہے اور غلط کیا، مجھے نہیں معلوم۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں اس وقت بھی سب کچھ محسوس کر رہی ہوں۔ باہر دھند میں کھوئے ہوئے مناظر، کمرے میں کھیلتی ہوئی میری اکلوتی بیٹی، تیزی کے ساتھ گھومتا ہوا پنکھا، بجتا ہوا ریڈیو، الماری میں رکھے ہوئے خوبصورت کھلونے، عید اور میری بیٹی کی سالگرہ پر آئی ہوئی GREETINGS سب کچھ دیکھ رہی ہوں، سب کچھ محسوس کر رہی ہوں، پھر بھی ایسا احساس ہو رہا ہے، جیسے یہ سب کچھ میرے لئے نہیں، میں ان سب کے لئے نہیں، میرے لئے وہ ہے جسے آج .... ابھی ابھی میں نے پہچانا ہے...

تم کہاں تھے دوست؟ جاڑے اور برسات کی شدید، اندھیری، سرد اور

بارانی راتوں میں ڈر ڈر کر میں آشو سے لپٹ لپٹ کر سوئی، لیکن تم نے اس وقت بھی مجھ سے نہیں کہا: "کائنات! میں یہاں ہوں۔"

اور میں یہی سمجھتی رہی کہ مجھ پر آسیب کا سایہ ہے۔ آشو کہتے "تمھیں وہم ہو گیا ہے کائنات" میں نے آشو کی بات کی آج تک تردید نہیں کی اس لئے خموش رہتی تھی۔ مگر میں اسے وہم کیسے سمجھ لیتی، میں نے تو یہ سب کچھ شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا، میں اس کے لمس سے واقف ہوں۔ میں لاکھوں کروڑوں میں ان دو آنکھوں کو پہچان سکتی ہوں، میں یہ کیسے کہہ دیتی، کہ "یہ تیرا وہم ہے کائنات" ان اُجاڑ اور بے رونق دنوں سے پہلے کبھی بھی ایسا ہوا ہوتا تو خود کو سمجھا لیتی، مگر شادی سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا، شادی کے بعد بھی میں برسوں تک اپنے رشتہ داروں میں گھری رہی۔ ہر لمحہ ایک نیا ہنگامہ، تمام دن شادمانیاں اور شب کی خموشیوں میں آشو کا پیار، میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے، لیکن جو کچھ سوچا نہ تھا وہ ہوا۔ کہ جب اس دُور دراز مقام پر آشو کا ٹرانسفر ہوا، اور آشو کے جانے کے بعد دن بھر مجھے تن تنہا رہنا پڑا تو ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میرے بغل میں کوئی آکر بیٹھ گیا ہے۔ میں گھبرا کر چیخ اُٹھی۔ جلدی سے اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو تم، کون ہو تم؟"

میں چیخ اٹھی لیکن جواب میں بس خموشی اور میری طرف نگراں دو آنکھیں....

خموش... ساکت... سپاٹ آنکھیں...

"آیا!" میں نے چیخ کر آیا کو پکارا اور وہ دوڑی دوڑی آئی، لیکن میری بات سُن کر وہ ہنسنے لگی۔

"بی بی جی، آپ کو وہم ہوتا ہے، کوئی بھی تو نہیں ہے۔"

لیکن میں تو دیکھ رہی تھی کہ وہ اب بھی کھڑا ہے۔

میں نے گھبرا کر آشو کے نمبر ڈائل کئے۔

"ہیلو ہیلو... آشو تم آجاؤ... تم آجاؤ آشو۔"

"ہیلو کائنات، کیا بات ہے؟ — کیوں گھبرا رہی ہو؟ — طبیعت خراب ہے کیا؟"

"نہیں آشو، طبیعت ٹھیک ہے... پر تم آجاؤ آشو!"

"لیکن کیوں کائنات؟ — شاذی ٹھیک ہے نا؟ — بات کیا ہے؟"

"ہاں آشو، سب ٹھیک ہے، پر تم آجاؤ!"

"پاگل ہوئی ہو... ابھی مجھے فوراً سائٹ پر جانا ہے۔"

"نہیں آشو! تم آجاؤ... پلیز آجاؤ!"

"پگلی کہیں کی... میں ایک گھنٹے میں آرہا ہوں۔" اور آشو نے فون رکھ دیا۔

"ہیلو ہیلو... آشو... ہیلو ہیلو!" میں چیختی رہ گئی، لیکن لائن کٹ چکی تھی۔

میں نے پھر نمبر ڈائل کیے، لیکن معلوم ہوا کہ آشو سائٹ پر جا چکے ہیں اور وہ ابھی تک میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے اپنی ساری طاقت یکجا کی اور بغل میں پڑی ہوئی لاٹھی اس پر چلائی، لیکن لاٹھی اس پر سے گذرتی ہوئی یوں دور چلی گئی، جیسے دھوئیں یا سائے پر گذری ہو۔

وہ یوں ہی خموش، ساکت کھڑا رہا... بس میری طرف نگراں دو آنکھیں ... ساکت... سپاٹ آنکھیں۔

مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا، میں کسی نہ کسی طرح اپنے بستر پر گئی اور شدید گرمی کے باوجود سر سے پاؤں تک چادر تان کر اپنی دانست میں اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی، مگر وہ اسی طرح خموش کھڑا رہا اور میں لرزتی رہی اور جب آشو آئے تو میں بیہوش پڑی تھی۔ آیا نے بتایا کہ میں دیر تک بے ہوش رہی، ہوش آیا تو آشو میرے پاس تھے۔ اور کوئی بھی نہیں تھا، اس روز آشو رات بھر میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوسرے دن میں نے زبردستی آشو سے دو دن کی چھٹی کی درخواست دلوادی۔ ان دو دنوں میں میری طبیعت بھی ٹھیک ہو گئی اور آشو نے بھی مجھے خوب خوب INTERTAIN کیا اور میں نے بھی یہی سمجھا کہ وہ یوں ہی میرے دماغ کا ایک خلجان تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی، میں بھول گئی، کہ

کوئی تھا جو دو دنوں سے میرے بغل میں آکر بیٹھ گیا تھا، مگر نظر نہ آیا تھا۔ پھر کئی دن گذر گئے، کچھ بھی نہ ہوا۔ زندگی پھر پرانے انداز سے بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن پھر سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو گیا۔

آشو آفس جا چکے تھے، ان کا کھانا ٹوکرے کر جا چکا تھا۔ میں قطعی بے کار تھی، اس لئے الماری سے البم نکالا اور یوں گھر اور بچپن کی یادوں میں گم تھی، کہ اچانک احساس ہوا کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے .... نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ سامنے کھڑا تھا... خموش ... ساکت... بس میری طرف نگراں دو آنکھیں... ساکت... سپاٹ آنکھیں...

میں بہت ڈر گئی، جلدی جلدی کسی طرح سے البم الماری میں رکھا اور شادی کو لئے کو لئے ہوئے باورچی خانہ میں چلی گئی، جہاں آیا اپنے باقی کام پورے کر رہی تھی، اور میں آشو کے لئے شام کا ناشتہ تیار کرنے لگی۔ میں نے آیا سے بے سروپا باتیں شروع کر دیں... ایسی باتیں جن سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

اور چند لمحوں بعد مجھے احساس ہوا کہ میں پھر اکیلی ہوں۔

آہستہ آہستہ یہ اس کا معمول بن گیا۔ ہر خالی، اکیلے اور اداس لمحے میں وہ آکر کھڑا ہو جاتا۔ اور پھر جب میں کسی کام یا کسی بات میں مصروف ہو جاتی تو وہ چلا جاتا۔

ایک دن زوردار بارش ہو رہی تھی، میں ورانڈے میں کرسی بچھائے بیٹھی تھی، وہیں پر میری بیٹی اپنے کھلونوں سے کھیل رہی تھی، کہ وہ دور سے بارش میں بھیگتا ہوا آتا نظر آیا۔ میں دوڑتی ہوئی آیا سے ایک پیالی گرم گرم چائے کے لئے اندر گئی، کہ اسے تولیہ لا کر دوں، مگر الگنی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سامنے ہی آشو کا آدھ سلا کرتا نظر آیا اور میں کمرے ہی میں مشین کھول کر کرتا سینے لگی۔ کچھ دیر بعد آیا چائے لے کر آئی تو اس کا خیال آیا۔ جی چاہتا کہ باہر جا کر دیکھوں، مگر میں اپنی نظریں جھکائے کرتا سیتی رہی۔ اور جب آیا چائے کی پیالی رکھ کر واپس چلی گئی، تو آہستہ سے چائے کو کھڑکی سے نیچے گرا دیا۔

تو یہ سب کچھ ادھر چند دنوں سے چل رہا ہے اور جب سے یہ سب کچھ چل رہا ہے، تب سے میں ہوں بھی اور نہیں بھی۔ کبھی یہ ساری کائنات بہت پیاری لگنے لگتی ہے اور کبھی یہ

سارا کھڑاک فینٹسی کے علاوہ کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔

ایک مرتبہ آشو سے کہا بھی، کہ "کوئی ہے جو میرے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے لیکن نظر نہیں آتا۔" تو آشو ہنس کر کہنے لگے۔ "اتنا پڑھ لکھ کر بھی ایسی وہمی ہو تم کائنات؟" میں انھیں کیا بتاتی، کہ یہ سب کچھ تو مجھ پر گذرا ہے... کبھی شدید گرمیوں میں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں وہ پسینے پسینے آیا اور کچھ دیر مجھے دیکھ کر چلا گیا... کبھی کٹکٹاتی ہوئی سردیوں میں ایک پرانا کوٹ پہنے سردی سے ٹھٹھرتا ہوا آیا، کچھ دیر رہا، پھر واپس ہو گیا... کبھی ایسا ہوا کہ شام زینے زینے اتر رہی ہے، میں زینے زینے اترتی ہوئی اس شام کو دیکھنے میں محو ہوں کہ وہ چپکے سے آکر بغل میں کھڑا ہو گیا ہے.... اب تو کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ بہت دن گذر جانے پر بھی وہ نہیں آتا تو میں جیسے اس کا انتظار کرنے لگتی ہوں، اور جی چاہتا کہ وہ آئے تو اس سے پوچھوں، کہ کیوں جی، اتنے دن کہاں تھے؟"

اور کبھی کبھی خوف بھی آتا، کہ کون ہے، جو مجھ میں بھی نہیں، مجھ سے بھی نہیں، پھر بھی مجھ سے الگ نہیں...

کیسا عجیب ہے یہ سب کچھ... کتنی پُراسرار ہے یہ کائنات... کس قدر بے معنی اور بے مطلب ہے یہ زندگی... یہ زندگی جو میں جی رہی ہوں، اس کا حاصل کیا ہے؟ یہ جو کچھ حاصل ہو!... آشو اور میری بیٹی شاذی، اور یہ دولت، آرام و آسائش، نت نئی پارٹیاں، تقریبات، یہ رنگ برنگی دنیا... ان سب کا حاصل کیا ہے؟

اب تو کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ گیروا لباس پہن کر گھر گھر صدا لگاؤں.... یہ دُنیا رین بسیرا یا... یہ دُنیا رین بسیرا!... لیکن یہی سب کچھ جو میں سوچتی ہوں اگر لوگوں سے کہوں، تو لوگ یہی کہیں گے "تو پاگل ہو گئی ہے کائنات!" اور میں سوچتی ہوں کہ اب میں واقعی پاگل ہو جاؤں گی۔ ایسی دُبدھا اور کشمکش میں کوئی جی بھی کیسے سکتا ہے؟... من میں کچھ... باہر کچھ... اور من میں بھی جو کچھ ہے وہ جانا پہچانا نہیں، ... دُھندلا دُھندلا...، سایہ سایہ! اور ابھی ابھی جو کچھ جانا بوجھا بنا ہے، یہ کیسا دُکھدائی ہے ع:

"کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتا بھی نہ سکوں"

میں دریچوں کے شیشوں سے اپنا چہرہ ٹکا دیتی ہوں... میری آنکھ سے پانی کی ایک لکیر شیشوں کو نم کر رہی ہے، اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ پانی کی اس ایک لکیر میں میرا پورا وجود ہچکولے کھا رہا ہے۔

میں ایک مرتبہ پھر سہسرام سے آیا ہوا خط پڑھتی ہوں۔

"وقار تمھیں بہت یاد کرتا ہے"

میں بار بار اس جملے کو دہرا رہی ہوں۔ "وقار تمھیں بہت بہت یاد کرتا ہے.... وقار تمھیں بہت یاد کرتا ہے... وقار تمھیں بہت یاد کرتا ہے۔

میں بار بار یہ جملہ دہرا رہی ہوں، اور بار بار یہ کوشش کر رہی ہوں کہ اِس خیال کو جھٹک کر کنارے پھینک دوں۔

آخر وقار کے یاد کرنے سے اور میری اس پریشانی سے کیا تعلق؟ ایسے کتنے۔ وقار دُنیا بھر میں کتنی کائناتوں کو یاد کرتے رہتے ہوں گے، تو اس سے دُنیا بھر کی ساری کائناتوں پر اُداسیب کا سایہ تو نہیں ہو جاتا، اور پھر میری یہ دوست بھی عجیب لڑکی ہے اُس پاگل لڑکے کا ذکر کوئی اتنا ضروری تو نہیں تھا، کہ ہماری آپس کی گفتگو میں بھی وہ موضوع بنے... اور آشو بھی خوب ہیں، خط پڑھ کر کہنے لگے "بھئی یہ وقار تمھیں اتنا بھولا نہیں ہے، اُسے کبھی کبھی خطوط کیوں نہیں لکھ دیا کرتی ہو؟"

"ہُش.... میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے"۔ میں نے مُنہ بنا کر کہا اور آشو ہنستے ہوئے چلے گئے.... میری دوست کی تحریر پھر چمکنے لگتی ہے

"وقار تمھیں بہت یاد کرتا ہے"

میں پھر سرگوشیوں میں کہتی ہوں... وقار تمھیں بہت یاد کرتا ہے... وقار تمھیں بہت یاد کرتا ہے... اور میں ایک بار پھر بند دریچوں کے شیشوں سے باہر دیکھتی ہوں۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے اور اندر میں ہوں اور میری بیٹی ہے اور اس کے کھلونے ہیں اور میری اردگرد کی دنیا ہے اور چھت میں لٹکتا، گھومتا اور چکر لگاتا ہوا

پنکھا ہے۔ پنکھا اپنی پوری رفتار سے گھوم رہا ہے لیکن کمرے کے اندر گھٹن بڑھتی جا رہی ہے، ... چاروں طرف حبس... تھمنا زنداں کی... میری سانس رک رہی ہے... کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے، جیسے ابھی فوراً یہ سب کچھ رک جائے گا... تھم جائے گا!

اور ایسی ہی ایک حبس زدہ شام میں میں نے وقار سے پوچھا تھا... یوں ہی مذاقاً پوچھا تھا۔

"تمھیں کون سی لڑکی پسند ہے وقار؟"

اور وہ مجھے بہت دیر تک دیکھتا رہا... خموش... ساکت۔

پھر آہستہ سے پوچھا

"خفا تو نہیں ہو جائے گا کائنات؟"

میں سمجھ نہیں پائی۔ "بھلا میں خفا کیوں ہونے لگی؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں، آپ وعدہ کیجیے، کہ آپ خفا نہیں ہوں گی۔"

"چلو بھئی وعدہ رہا۔"

اور تب وہ دور ٹہلتا ہوا گیا اور کمرے سے آئینہ اٹھا کر لایا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھے اس بدتمیزی پر سخت غصہ آیا اور میں نے آئینہ اٹھا کر پٹخ دیا اور اسے سخت سست کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، اور پھر وہ بہت دنوں تک میرے یہاں نہیں آیا۔

میرے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ نہ میرے پاس اس قسم کی فضول اور واہیات باتوں کے لئے وقت تھا، اور نہ خود وقار اس قابل تھا کہ اس کے سلسلے میں اس قسم کی کوئی بات سوچی جا سکے۔

پھر کچھ دنوں بعد میرے یہاں ایک تقریب میں سب لوگوں کے ساتھ وہ بھی آیا۔ خموش خموش... گم سم... میں نے جب بھی دیکھا تو اسے اپنی طرف دیکھتا پایا... پھر اس کے بعد جب بھی وہ آیا، یا جہاں بھی وہ نظر آیا میں نے ہمیشہ اسے چپ چپ پایا... کبھی اس نے مجھ سے پھر کچھ بھی نہیں کہا۔ بس اپنی طرف نگراں ـــ خموش آنکھیں... جیسے ان

آنکھوں کے سہارے میرے پورے وجود کو وہ اپنے اندر جذب کر لے گا... مجھے یہ سب کچھ بہت دلچسپ لگا... میں نے اپنی دوستوں کو بھی یہ سب کچھ بتایا اور شادی کے بعد آشو کو بھی یہ سب کچھ سنایا تو وہ بھی بہت ہنسے۔

میں ایک بار پھر اپنے ذہن کو اس واہیات خیال سے آزاد کرانے کے لئے سر کو جھٹکتی ہوں... ابھی ابھی آشو آئیں گے اور ان کے ساتھ مجھے جانا ہے۔ شہر کے مشہور ماہر نفسیات کے یہاں، آشو کا خیال ہے کہ یہ ایک وہم ہے اور اس وہم کا علاج دوا یا دعا سے نہیں بلکہ نفسیاتی تجزیئے ہی سے ممکن ہے۔

میں پھر شیشوں سے باہر دیکھتی ہوں، باہر بارش بہت تیز ہو گئی ہے سب کچھ پانی میں تر بتر ہو رہا ہے، میں شیشوں سے گال چپکائے باہر کی طرف دیکھ رہی ہوں، مسلسل دیکھے جا رہی ہوں... بلا وجہ... بلا مقصد... کیوں؟... شاید مجھے کسی چیز کی تلاش ہے،، کس چیز کی؟ یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں... بس میں دیکھے جا رہی ہوں... مسلسل دیکھے جا رہی ہوں... اور تب اسی دھند اور بارش کی مسلسل تیز اور گہری شبیہہ کے درمیان سے ایک اور شبیہہ ابھرتی ہے۔

وہ چلا آ رہا ہے، بارش میں بھیگتا ہوا... سر سے پیر تک بارش میں تر بتر ہوتا ہوا وہ دوڑتا ہوا آ رہا ہے، جیسے کوسوں کا سفر طے کر کے آ رہا ہو لیکن اس کے دوڑنے کا انداز وہی پہلے جیسا ہے... وہ دوڑ رہا ہے سڑک پر... اور دیکھ رہا ہے میری طرف... خموش.... سپاٹ... بے زبان آنکھیں... جیسے ان آنکھوں کو گنگ کر دیا گیا ہو... اور میں چونک کر اٹھتی ہوں... میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں... کچھ سائے... کچھ شبیہیں... کچھ رنگ... ایک کے بعد ایک... ایک کے بعد... فلم... ایک کے بعد ایک فلم... تیزی کے ساتھ آنکھوں کے سامنے سے گذرتی چلی جا رہی ہے۔ میں گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتی ہوں تو بند آنکھوں کے سامنے سہراب سے آئے ہوئے خط کی تحریر چمکنے لگتی ہے...

"وقار تمہیں بہت یاد کرتا ہے"

میں سرگوشیوں میں کہتی ہوں ——

"وقار تمھیں بہت یاد کرتا ہے ... وقار تمھیں بہت یاد کرتا ہے ... وقار تمھیں بہت یاد کرتا ہے ... وقار... وقار... "

تب اچانک مجھے بہت ساری صبحیں، شامیں، دوپہریں یاد آجاتی ہیں ... ایک اُداس، خموش چہرہ ... بولائی بولائی آنکھیں... میری جانب نگراں آنکھیں... جیسے آنکھوں کے سہارے ہی وقار مجھے اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہو... اور سڑک پر دوڑتا ہوا اور میری طرف دیکھتا ہوا یہ شخص جو اَب دروازے تک پہنچ چکا ہے... وقار اور یہ ... وقار اور یہ... وقار اور یہ ...

اور تب میں بے ساختہ دوڑتی ہوں اور آج پہلی مرتبہ دروازہ کھول دیتی ہوں ... وہ اندر آجاتا ہے ... میں آہستہ سے اپنی دوست کا خط چاک کر کے دریچے سے باہر پھینک دیتی ہوں، کہ اَب اس کی ضرورت نہیں رہی ..... اور تب اسی لمحے آنسو دروازے پر دستک دیتے ہیں۔

"آیا! دروازہ کھول دو۔"

میں کمرے میں سے آیا کو پکار کر کہتی ہوں، اور خود سوچتی ہوں کہ آنسو آئیں گے، تو اُن سے کہوں گی کہ "میں کسی ماہرِ نفسیات کے یہاں نہیں جاؤں گی۔"

اور آنسو اَب کمرے میں آگئے ہیں۔ مجھے عجیب سا احساس ہو رہا ہے، جیسے کمرے میں نہ میں ہوں، نہ آنسو ہیں۔ یا پھر کمرے میں ایک بھیڑ جمع ہے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں شاید ڈھیر سارے لوگ چلے آئے ہیں ... باہر بارش بہت تیز ہو گئی ہے، ہواؤں کا زور اور بھی بڑھ گیا ہے، دریچوں کے شیشوں سے ہوائیں ٹکرا ٹکرا کر بار بار آواز پیدا کر رہی ہیں۔ شاید وہ اندر آنا چاہتی ہیں لیکن ناکامی ان کا مقدر ہے ... اور اندر میں ہوں، آنسو ہیں اور کوئی نہیں ہے ... اور بہت بھیڑ ہے ... اِتنی گھٹن ... اتنا حبس ... ایسا لگتا ہے جیسے آج سب کچھ رُک جائے گا ... تھم جائے گا!!

اور میں سوچتی ہوں کہ اِس شام اور اُس شام میں فرق ہی کیا ہے .... اور اَب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے ..... میں آنسو کے شانے پر سر رکھ کر سسک سسک کر

رونے لگتی ہوں....

"آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جایا کیجیے آشو..... مجھے بہت ڈر لگتا ہے.... بہت ڈر لگتا ہے..."

اور جب آشو مجھے اپنے قریب کر کے میری پیٹھ تھپتھپانے لگے اور مجھے سمجھانے لگے تو میرا جی چاہا کہ میں آشو سے کہوں ——

"آشو!..... آپ باہر چلے جایئے... بارش بہت تیز ہے... وہ بارش میں بھیگ رہا ہوگا ——!!"

شکستیدہ

ڈاب کا پانی تو بہت میٹھا ہوتا ہے، یہ زہر کیسے بن گیا؟

میرے اِرد گرد پھیلے ہوئے یہ لوگ....

اور دُھند کے اُس پار....؟

(صحراؤں کی اُس انجمن میں کیوں لے جانا چاہتے ہو جہاں یادوں نے اپنی گرہی کے علاوہ کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔)

تو پھر یوں ہوا تھا کہ جب ہم نے لنگر اُٹھایا تو یہ سمجھا تھا کہ اب اِس کنارے اور اُس کنارے سے ہمارا ہر تعلق ختم ہو چکا ہے۔ ہمارا جسم، ہماری روح، ہماری جِلد، ہمارے خون کے مسامات، ہماری صبحیں، ہماری شامیں سب ہمارے ساتھ ہمارے نئے مکان تک جائیں گی، مگر یہ کیا ہوا کہ جب ہم ٹوٹ پھوٹ کر نئے درختوں کے سائے میں پہنچے تو یہ احساس ہوا کہ سب کچھ تو وہی ہے، البتہ ہم!.... کہ ہم اپنے آپ کو محفوظ کرنا چاہتے تھے خود غیر محفوظیت کا شکار ہو گئے....

یوں ٹوٹ ٹوٹ جانے کے بعد بھی یہ سمجھنا کہ ہم محفوظ ہو گئے ہیں، کم از کم میرے خیال میں کسی عقلمندی کا ثبوت نہیں۔

مگر.....؟

ہاں! عقل و خرد کے تار و پود تو خود ہم نے بکھیرے ہیں۔

اپنی ماؤں کے دھلتے پہ کھڑے ہونے والے کسی جیالے میں اتنی ہمت ہے؟ کہ قبروں سے ان لوگوں کی ہڈیاں نکال کر پھینک دے جنھوں نے ہمیں اکسپلائٹ کیا، کہ ہم تمھیں شیر دیں گے اور اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ ہم سے ہماری وہ جھونپڑی بھی چھن گئی جو لاکھ خستہ سہی، مگر سر چھپانے کے کام تو آسکتی تھی۔ میرے چاروں طرف آگ، خون اور ہنگامہ ہے۔ ہم نے اپنے اپنے مورچے سنبھال رکھے ہیں، مگر ہمارے دلوں کا وہ خوف تو بہر حال ختم نہیں ہو سکتا کہ "شکست بھگوڑوں کا مقدر ہے"۔

ہماری مثال اس بکری کی سی ہے جسے چارے کے طور پہ مچان کے نیچے باندھ دیا جاتا ہے، تاکہ شیر ہماری طرف آئے اور تب شکاری اس کا شکار کریں۔

ایک دن پہلے پڑوس والوں کو ایک صف میں کھڑا کر کے نئی دنیا کی لذتوں سے آشنا کرایا گیا ہے، اور آج یا کل ہمارے ساتھ بھی یہی ہو سکتا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہو گا وہ سب صحیح ہے.....

ہم نے اپنے ذاتی مکانات کسی انجانے اور دھندلے خوابوں کی آرزو میں دوسروں کے حوالے کر دیئے اور خود کرائے کے مکانات میں رہنے کے باوجود مالک بن گئے۔

قمیص اور لنگی پہنے ہوئے وہ آدمی جو گھروں کو روشنی بخش رہا ہے، ہم نے بائیس برسوں تک اسے مٹی کا تیل بھی نہیں دیا اور خود ٹیوب لائٹ سے اپنے کمروں کو روشنی بخشتے رہے۔

میرا نوکر جو رجو گاتا اور دف بجاتا چلا آرہا ہے، ہم نے اسے کبھی پلنگ پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی اور اس لئے آج جو کچھ ہو رہا ہے، یہ سب کچھ تو بہر حال ہونا ہی ہے اور بھی نہ جانے کتنی قسطوں میں یہ قرض وصول ہو گا؟ مگر دل تو بہر حال دل ہے؟ بھیا!

میرے یہ بچے... کومل، سُبک اور نازک سے پھول، جنھیں میں نے کبھی گرم نگاہی کی لذّت سے بھی اس لئے آشنا نہیں کیا، کہ اگر ان آنکھوں میں گرم نگاہی کا کوئی مدّھم سا احساس جاگ پڑا تو کیا ہوگا؟

اور وہ بچے چاکلیٹ خریدنے جائیں اور عیسیٰ بن جائیں.. تم سُن رہے ہو نا؟

میں تمھیں بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں مگر میرے پاس (غالباً) اب وقت نہیں ہے پھر بھی تم خود محسوس کرتے ہوگے کہ قطعیّت کا مسئلہ اس دَور میں جس طرح ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھرا ہے، ایسا شاید کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

ممکن ہے کہ میں نے کبھی سمندر کی لہروں کے رُخوں کا اور سیلاب کی تباہ کاریوں کا تعیّن کیا جانا آسان ہو، مگر اب یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ سمندر کے اس کنارے کی لہر اس شہر کو آباد یا برباد کرتی ہے اور اُس کنارے کی لہر اُس شہر کو آباد یا برباد کرتی ہے...“

وہ مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے گئے تھے اور تبھی مغربی دیوتاؤں نے صورِ اسرافیل پھونک دیا اور مسجد روئی کے گالے کی طرح فضاؤں میں بکھر گئی۔

اور میرے بچے بازار سے چاکلیٹ خریدنے گئے مگر ڈاب کا پانی اُن کے لئے زہر بن گیا۔

پرایا گوشت تو سب کو لذیذ لگتا ہے۔ میں اگر باہر نکلوں گی تو میرا گوشت بازار میں بکنے لگے گا اس لئے مجھے تو بہر حال اسی کمرے میں دُھندلکوں کو اپنی منزل بنانا ہوگا...

عون! میرا آخری سرمایہ... تم تک اگر پہنچ سکا، تو سکون ہوگا کہ عون، حسین کی پناہوں میں جی رہا ہے لیکن اگر عون، حسین کی پناہوں میں نہ پہنچ سکا تو...؟

اس کے بعد نامکمل خط پہ خون کے دھبّے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہیں پر سے کوئی لاش گھسیٹتی ہوئی بہت دُور تک لے جائی گئی ہے۔

میں بالکونی پہ ریلنگ کے سہارے کھڑا ہوں، مگر پھر بھی ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے پل بھر میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ میرے پاس نہ تو عون پہنچا ہے اور نہ زینب کا کوئی خط آیا ہے، مگر میں روز یوں ہی بالکونی پہ ریلنگ کا سہارا لئے دن بھر کسی شے کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ مجھے کس چیز کی تلاش ہے، یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں کبھی کبھی

احساس ہوتا ہے کہ میں یوں ہی تمام عمر بالکونی پر ریلنگ کا سہارا لئے کھڑا رہوں گا اور آخر کوئی ایسا دن آئے گا جب لوگ آہستہ سے مجھے اپنے بازوؤں اور شانوں پر سنبھال کر جھیل میں تیرتے رہنے کے لئے چھوڑ دیں گے ... لیکن پھر کبھی احساس ہوتا ہے کہ نہیں میں بالکونی پر نہیں ہوں ... میں تو تاریل کے درختوں کے سائے میں ..... بہتے ہوئے پُرشور دریا کی رتیلی سرزمین ... پہاڑیوں کے دامن میں ... چپٹی ناک والے معصوم لوگوں کے گھروں میں ... آنگنوں میں ... شاہراہوں پر ... میں ہر جگہ گھوم رہا ہوں ... بچوں کے بھیجوں پہ ... ماؤں کی شرم گاہوں پہ ... بہنوں کی چھاتیوں پہ ... میں رو رہا ہوں ... میں ہنس رہا ہوں ... میں قتل ہو رہا ہوں ... میں قتل کر رہا ہوں ... "

تو پھر یوں ہوتا ہے کہ میں اکثر ریلنگ سے سر ٹیک کر سسک سسک پڑتا ہوں اور سوچتا ہوں ... میں مر کر شہید کہلایا اور امر ہو گیا۔

میں زندہ ہوں صحیح سلامت ہوں، مجھ پہ کچھ بھی نہیں گذری۔

یوں ہی ایک دن چپ چپاتے مر جاؤں گا۔

وہ موت ؟

یہ موت ——؟

وہ زندگی ——؟

یہ زندگی ——؟؟

مردہ آنکھوں کا زہر

سب کچھ میری نظروں کے سامنے ہوا۔
میں شاید تم تک ان باتوں کی ترسیل نہ کر پاؤں لیکن میری آنکھوں میں جھانکو ان آنکھوں میں تمہیں اپنی آنکھوں کا رنگ نظر آئے گا۔ نہ تم جھوٹے ہو اور نہ میں ہم سب نے قطرہ قطرہ دم توڑتی شب کا زہر اپنے سمندر میں دفن کر دیا ہے لیکن اس رات کا کوئی ایک ٹکڑا بھی میں نہ تو دفن کر پایا ہوں اور نہ جلا پایا ہوں، مجھ سے ان لمحوں کا حساب مت مانگو کہ اگر میں حساب دینے بیٹھ گیا تو دھرتی اور آکاش سب پہ ہر طرف لال رنگ چھا جائیں گے اور پھر سرخی ..... یہ سرخی زمین و آسمان سے پرے کہاں تک چھا جائے۔ اس کا فیصلہ وقت کے حوالے کرنا ہوگا، لیکن اتنی بات کا یقین رکھو کہ وہ رات آخری رات ہم پہ بلاؤں کا نزول لے کر آئی تھی، ہم صدیوں سے جاگے، سوئے، اور نہ جانے کن کن اعمال سے گذرے ہوئے انسان اس رات یہ محسوس کرنے پر مجبور تھے کہ آج خلائی وحدتوں نے سر سے لے کر تہ تک اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں، اور تب اسی لمحہ، اور پھر اس لمحہ کے بعد ہر لمحہ، یا شاید بیچ کے چند لمحوں کے توقف کے بعد (کہ آج تک میں

لمحوں کو اپنی گرفت میں نہیں کر سکا ہوں) موٹر، جہاز، ریل گاڑیاں، پیٹن ٹینک اور بمبار جمبو جیٹ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ مجھ سے بظاہر برابری کا ناطہ کرنے کے لئے آ رہے تھے لیکن میں نے ان کی خندقوں میں جھانک کر دیکھا تو ہمارے ہر گھر کے نام اور پتے درج دکھائی دے۔

اور تب اس رات وہ سب کچھ میری نظروں کے سامنے ہوا جس کے بارے میں میں نے بزرگوں سے سنا تھا اور کتابوں میں پڑھا تھا۔

میں جن لمحوں کا اسیر تھا اور لمحے جس فضا میں تیر رہے تھے وہاں ہواؤں نے آنا جانا چھوڑ دیا تھا اور لمسوں کا انحطاط نقطۂ انجماد تک پہنچ چکا تھا۔

..... باہر پٹاخے چھوٹ رہے تھے، پٹاخے جو روشنیاں بخشتے ہیں، روشنیاں جو آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلاتی ہیں، اور ان اندھیروں میں بھی میرا ساتھی بس ایک ٹک پتھر کے آسمان کی طرف تاک رہا تھا۔ میں نے اس کے اندر جھانکا تو بے ساختہ مجھے ہنسی آئی، وہ ان دودھیا رستوں کا منتظر تھا جہاں سے کسی کے آنے کی امید باقی تھی اور جس کے آنے کی خبر بہت پہلے سے دی جا رہی تھی۔ "میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہوں" جنہیں آنا تھا وہ سب آ گئے ہیں، اب تو مسئلہ صرف کھڑے ہو کر گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کا ہے دوست۔"

لیکن لفظوں کے اس الٹ پھیر میں ہار ہمیشہ میری ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ جو میرے سامنے ہے اور وہ جو میرے پیچھے ہے اور وہ جو میرے آگے ہے، اور وہ جو میرے اندر ہے، اس کا بس ایک ہی خیال ہے کہ لمحہ، وہ لمحہ ابھی نہیں آیا ہے جب سب کچھ ہواؤں میں بکھر جائے اور ہم صرف مکھیوں کے کاروبار کو آگے بڑھانے کی بات سوچیں تو میں تم سے اگر یہ کہوں کہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا تو تم پوچھو گے کہ "آخر ہوا کیا؟"

لیکن میں کیسے بتاؤں کہ زنجیری ماتم مجھے ہمیشہ خوفناک لگا،

لیکن میں کیسے بتاؤں کہ زنجری ماتم مجھے ہمیشہ خوفناک لگا، کاش میں شیعہ ہوتا تو حسین حسین کرتا ہوا میں بھی آگ کے انگاروں پر سے گذر جاتا اور سینے کی سرخی کو سارے جہاں کا مقدر بنا دیتا مگر میں نہ تو شیعہ ہوں نہ سنی میں ایک آدمی ہوں جو چاروں طرف سے بند کمرے میں مسلسل چار دنوں تک دوستوں کی نظر بچا کر بسکٹ سے اپنا پیٹ بھرتا رہتا ہے اور جب آخری لمحہ میں دوست حرامی اور کمینہ کے خطاب سے نوازتا ہوا اس کے سینے پر چڑھتا ہے تو وہ بہت اطمینان سے کہتا ہے "اب کچھ نہیں ہے دوست، سب ختم ہو گیا۔"

اور ان ساری باتوں سے پرے ایک وہ بھی ہے جس کی آنکھیں چلنے کا انداز بھول گئی ہیں اور ہونٹوں نے لفظوں کے گودام سے صرف روتے بلکتے لفظ برآمد کئے ہیں لیکن جو پھر بھی میرے اس ساتھی سے بہتر ہے جو ہر لمحہ دودھیا رستوں پہ نظر رکھتا ہے کہ اب رونا بلکنا اس کا شیوہ بن گیا ہے۔

اور تب اس آخری لمحے میں یہ ہوا کہ گھر کا ہر ذرہ منور ہو گیا ..... روشنی ..... روشنی ..... روشنی جو آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلاتی ہے اور تب مجھ سے وہ سوال کرتا ہے، چلے نا آخر دودھیا رستوں کی تلاش میں ؟"

دودھ اور پانی کی بات چھوڑو ..... نہر تلاش کرو نہر!" میں نے بھاگتے ہوئے اس سے کہنا چاہا، لیکن لاٹھی بولنا نہیں چپ رہنا سکھاتی ہے۔

اور جب آنکھ کھلی تو صبح ہو رہی تھی۔ پھوڑے کی طرح دکھتے ہوئے جسم نے زندگی کا احساس دلایا ..... ایک گھر کی دہلیز ..... اور میں ..... اور اردگرد رتجگے کی باسی نشانیاں "قبر"۔

رات کے واقعات ذہن میں گھومنے لگے۔

ابھی بھی آسمان دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔

فیصلوں نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور میں نے اپنا ذہن۔
"ممّا" دو ننھے ننھے ہاتھوں میں مٹی کا کوزہ
"تمہیں اتنی عقل کس نے بخش دی؟ اے معصوم بچے!"
اور تب اسی لمحہ ایک چیخ....."
"امی" سسکیاں اس کے ہونٹوں پر بلک بلک کر دم توڑنے والی تھیں کہ میری آنکھوں میں تیرنے والے اپنائیت کے رنگ نے اُسے (شاید) اطمینان دلایا ..... اور تب اسی لمحہ دوڑتے قدم ..... آوازیں.....
"بچہ کہاں گیا ..... سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے" میرے دوڑتے بھاگتے قدم اور میرے شانوں پہ وہ ....."
میرا جی چاہا کہ میں اک لمحہ کے لئے رک جاؤں اور اپنے دوست کو کہیں سے بھی آواز دے کر بلاؤں اور اس سے کہوں "تم دودھیا رستوں پہ جس کے منتظر تھے، وہ آگیا" لیکن میرے دوڑتے بھاگتے قدم اور میرے شانوں پہ وہ ....."
میں عقبی دروازے سے ایک کمرے میں داخل ہو کر اندر سے چٹخنی لگا دیتا ہوں لیکن آوازیں ..... قریب و دور سے آتی ہوئی آوازیں.... ..... میں بے بسی سے بچے کی سمت تاکتا ہوں اور بچہ میری سمت ....."
اور پھر بغل کے کمرے کی چیخ ....."
میں بیتابی سے ایک شگاف سے اس کمرے میں جھانکتا ہوں، ازلی اور ابدی مخصور تنہا عورت ..... نہیں، میں نے غلط کہا..... تنہا بے سہارا بچی ..... اور ایک سہمی ہوئی فاختہ ..... اور میرا ساتھی جو دودھیا رستوں سے اس کے آنے کا منتظر تھا..... ساری، بلاؤز، تہبند ایک طرف، سہمی ہوئی بے سہارا بچی ایک طرف ..... میرا ساتھی آگے بڑھ کر اس کے سینے پہ دانت کاٹتا ہے، ہونٹ چوستا ہے

..... پھر دونوں پیر چیر کر ناف کے نیچے ....."

ایک بعد دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا، پھر..... پھر ..... پھر ....."

میں سہم کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں لیکن تیسری آنکھ کی حقیقت اسی لمحہ معلوم ہوئی جب میں نے بند آنکھوں سے بھی سب کچھ دیکھا، سب کچھ سنا! اور وہ آخری چیخ تھی جب میں نے اپنی دونوں آنکھیں ہڑبڑا کر کھولیں .....

مریم..... اے مریم!

میں اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے اس کمرے میں تڑپ رہا ہوں اور اس کمرے میں ناف کے بیچ سے دو ٹکڑے کی ہوئی مریم خاموش پڑی ہے ..... اور پھر اچانک میرے کمرے کا دروازہ ٹوٹ جاتا ہے .... میں، وہ اور تم ..... اور میں ..... صرف میں ..... ہر طرف میں ..... بس میں ہی ہوں!

اور جب بھالا میرے سینے میں پیوست ہو گیا تو تڑپتے ہوئے میں نے دو ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔

میرے گلے میں حمائل یہ باہیں ..... ننھی ننھی، پیاری پیاری باہیں ..... اور میں ..... اور وہ ....."

خداوند اسی طرح میرے سینے سے لگے رہو..... مجھے اپنے آپ میں جذب ہونے دو ..... میرے بالکل قریب رہو .... بالکل پاس ..... میرے سنگ سنگ ....."

اور مرنے والے کی آنکھوں کا آخری سوال آج بھی جہاں چاہو، جب چاہو پڑھ لو ....." خداوند! تمہارے حواری اگر اسی طرح ایک ایک کر کے مرتے رہے تب؟ تب؟؟

پسِ پردۂ شب

اُس پر اچانک نظر پڑی اور پھر ہر منظر کی کیفیت بدل گئی ——

میں تو اردگرد کے مناظر کے حسن میں گم تھا مجھے کیا خبر تھی کہ ایسی صورت حال سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے!

ہم کئی دوست اتفاقاً اُس شاہراہ پر چل نکلے جو شہر سے باہر کی طرف جاتی ہے۔ روز کی متعینہ سرحدوں سے آگے بڑھے تو اسٹیشن آیا پھر دو رویہ مکانات کا سلسلہ بہت دور تک رواں دواں رہا اور پھر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

بیچ میں آگے کی طرف بڑھتی ہوئی شاہراہ اور دونوں طرف دھان کے سرسبز کھیتوں کا سلسلہ اور انہی کھیتوں کے بغل سے ایک چھوٹا سا ضمنی راستہ بائیں طرف مڑتا ہوا جس کے کنارے کنارے سون ندی کی ایک چھوٹی سی شاخ سبک روی کے ساتھ ہمسفر!

کچھ دور جا کر ایک نئی زیرِ تشکیل عمارت نظر آئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ

نئے کالج کی عمارت ہے جو اسی سیشن سے شروع ہونے والا ہے۔ ہم بہت دیر تک وہاں ٹھہرے کالج کے مختلف شعبے دیکھتے رہے۔ گورننگ باڈی کے کچھ اراکین بھی آ گئے تھے جن سے باتیں ہونے لگیں اور ان کے پرجوش عزائم کا علم ہوا۔ انہیں سے پتہ چلا کہ آس پاس کے لڑکے جوق در جوق داخلہ لینے چلے آ رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ عملی مشکلات کا بھی تذکرہ کیا اور ہم لوگ صرف زبانی ہمدردی کے چند پیتر ے چل کر آگے بڑھ گئے۔

اس کا کسے پتہ تھا کہ کچھ ہی دور آگے چل کر ایسی کسی صورتِ حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا جو پچھلے سارے مشاہدوں اور معروضات کو چور چور کر دے گا ——

اس ضمنی راستے پہ کچھ اور آگے چل کر ہم گاؤں کی سرحد میں داخل ہوئے تو شام ہلکے سروں میں گنگنانے لگی تھی۔ سورج کا سرخ تھال اپنی انتہا کی طرف جھک رہا تھا اور گاؤں کی اونگھتی ہوئی پرسکون آبادی اس جھٹپٹے کے عالم میں شہر کی ہنگامہ خیز دنیا کے مقابلے میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ دوستوں نے دھندلکوں میں کھوئے اس منظر کو دیکھ کر بڑے حاسدانہ خیالات کا اظہار کیا۔ بعضوں نے کہا کہ یہی لوگ بہتر ہیں کہ انھیں فضول قسم کی این و آں کی بحث اور دنیا کے خرخشوں سے کچھ لینا دینا نہیں اپنی زندگی جئے جا رہے ہیں۔ جس پر دوسرے نے نہایت سفاکانہ انداز میں اس خیال کی کاٹ کی کہ "یہ زندگی نہیں موت کی نشانی ہے"۔ میں چپ تھا کہ مجھے یہ سارا کچھ بہت چھوٹا چھوٹا لگ رہا تھا ——

ہم جس چھوٹی سی سڑک پر چل رہے تھے اس کے بائیں جانب گاؤں کی پرسکون آبادی تھی جہاں شام کے استقبال کے لئے چراغ جل چکے تھے۔ ہمارے پیچھے چھوڑی ہوئی وہ شاہراہ جس کے کنارے کالج کی نئی عمارت بن رہی تھی اور ہمارے بائیں سمت ندی کی وہ چھوٹی سی شاخ جو سڑک کے اس آخری کنارے پر پرسکون تھی اور بیچوں بیچ کالج کے بالکل قریب جہاں بندھ باندھ کر پانی جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی منسرب لہروں سے پر، اوپر سے پانی نشیب میں پرشور آواز کے ساتھ گرتا جو بہا

پھینٹیں اڑاتا، میں ڈرا کہ شاید یہاں گہرائی زیادہ ہو مگر دوستوں نے بتایا کہ یہاں تو سب سے کم گہرائی ہے کہ نہر کے اِس حصّے کے نیچے کی زمین سیمنٹ کے ذریعہ پختہ کر دی گئی ہے اور یہاں زیادہ سے زیادہ گہرائی کمر بھر ہے، مجھے اس تضاد پر ہنسی بھی آئی کہ یہ پانی جہاں اتنا شور مچا رہا ہے وہاں یہ کم بخت کسی کو ڈبانے کی بھی طاقت نہیں رکھتا اور جہاں پرسکون ہے وہاں ہاتھی ڈوب جائے گا؟"

تو یاروں نے سمندر کی مثال دی اور مجھے کالج کے فرشتے یاد آئے۔

اور پھر بات وہیں آکر رکی کہ ندی گاؤں سے گذرتی ہے تو پرسکون ہوتی ہے۔

میرا جی چاہا کہ صرف اتنا پوچھوں کہ "بطا ہرنا بھائی؟"

اور گاؤں کی اونگھتی ہوئی آبادی پھر زیر بحث آئی۔

اور مجھے پھر یہ سب کچھ جھوٹا لگا لیکن میرے پاس میری بات کے لئے کوئی دلیل نہ تھی۔ ایسی سفاک بے رحم اور مکار دنیا میں دل کی کون سنتا ہے!

سب تو بس یہی کہتے ہیں کہ ندی گاؤں سے گذرتی ہے تو پرسکون ہوتی ہے۔

تو بائیں سمت ندی، دائیں طرف گاؤں اور میرے پیچھے وہ سڑک جو مسافتوں کی قاطع ہے اور اس کے پہلو میں دور دور تک لہلہاتے ہوئے کھیت اور میرے بالکل سامنے سورج کا سرخ تھال جو مغرب کی جانب اپنی انتہا کی طرف جھک رہا ہے اور بائیں سمت، اس طرف پھر مکانات کا سلسلہ ....."

گاؤں سے تاشے، دھمکے اور جھانجھ کی آوازیں آرہی ہیں۔ شاید اس گاؤں میں بھی شہادت حسینؑ کے سلسلے میں تعزیئے بٹھائے گئے ہیں، سورج کے سرخ تھال پر نظر پڑی تو وہ ایک ٹنڈ منڈ درخت کی شاخوں کے بیچ ایسے الجھا نظر آیا جیسے کسی کی گردن کاٹ کر اس کو اسی کے خون میں نہلا کر جھاڑیوں میں پھنسا دیا گیا ہو۔

اب ہم اس شاہراہ پر آگئے ہیں جو ہمیں دوبارہ شہر کی طرف لے جا سکتی ہے شاہراہ کے دائیں طرف کھیتوں کا سلسلہ اور بائیں سمت مکانات.....

کچے اور پکے!

شہر کے بالکل بغل میں دو خام مکانات عجیب عالم میں نظر آتے ہیں جیسے کسی سکے کو ٹرین کی پٹری پر رکھ دیا گیا ہو اور اس پر سے ٹرین گزر گئی ہو یا وہ آدمی جو ٹھونس کر اپنے اندر ہی اندر ڈھ گیا ہو۔

دوست بتاتے ہیں کہ پچھلی برسات میں بارش کے پانی نے یہ قہر ڈھایا۔

اور انہی مکانات کے سائے میں اچانک وہ نظر آ گیا اور ہر منظر کی کیفیت بدل گئی۔

بدن میں رعشہ، جھریوں دار چہرہ، ایک ایسا لینڈ اسکیپ جس میں پیہم زلزلوں نے دراڑ ڈال دی ہو، بے نور لیکن وحشت سے پر آنکھیں، بلند پیشانی، دھان کے سوکھے مرجھائے اور روندے خوشوں جیسے بال، قمچیوں جیسے ہاتھ، لکڑیوں جیسے پیر جو صدیوں کی مسافت کی چغلی کھا رہے تھے، جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی میلی جیکٹ دھوتی، ایک پھٹی ہوئی بنیائن۔ کانپتے ہاتھوں میں ایک ہانڈی، بظاہر کائنات کا ایک بے کار اور بے بس وجود ۔۔۔ لیکن اپنے کام میں مصروف!

"یار! یہ زندہ ہے؟" میں نے ہنس کر ایک طنزیہ جملہ پھینکا۔

"پہلے اپنے بارے میں فیصلہ کر لو کہ تم زندہ ہو یا مردہ تب اس کے بارے میں سوچنا" ایک ساتھی نے آہستہ سے کہا اور مجھے چپ لگ گئی۔

"لیکن یہ کر رہا ہے کیا؟" ایک نے توجہ دلائی۔

ایک چھوٹی سی ہانڈی میں کچھ بھوسہ اور کچھ کوڑا جمع ہے اور وہ اسے سلگانے کی کوشش کر رہا ہے، آگ بار بار بجھ جاتی ہے اور وہ بار بار جلانے کی کوشش کرتا ہے، کئی تیلی جل چکی ہے لیکن آگ روشن نہیں ہو پا رہی ہے کیونکہ وہ ہر مرتبہ تیلی جلاتے ہوئے اپنے بغل میں کھڑی بلند و بالا عمارت کو تکنے لگتا ہے اور کوئی تیز ہوا کا کوئی ہلکا سا جھونکا اس کے ہاتھوں کی فصیل کو توڑ کر اس نازک سے شعلے کو بجھا جاتا ہے لیکن اس کی ہمت بھی قابل داد ہے کہ وہ آگ روشن کرتے ہوئے اس عمارت کی طرف تکنا چھوڑتا ہے اور نہ آگ بجھ جانے پر پژمردہ ہوتا ہے۔

سفر اتنا دلچسپ ہے کہ ہم سب ٹھہر گئے لیکن ابھی ہم نے سورج کی طرف دیکھا تو وہ اور سرخ ہو گیا تھا۔ مغرب کی سمت ایسی سرخی تھی جیسے آگ لگ گئی ہو اور مشرق پہ رات چھا رہی تھی اور مشرق و مغرب کے درمیان بوڑھا آگ جلانے کی ناکام کوشش کرتا رہا، ہم کھڑے رہے وہ کوشش کرتا رہا اور آخر بہت ساری تیلی تباہ کر کے اس نے آگ روشن کر ہی دی اور جب آگ روشن ہو گئی تب مشرق و مغرب دونوں سیاہ تھے۔

"یارو! یہ آگ تیسویں تیلی سے تو روشن نہیں ہوئی؟" میں نے فضا میں ایک سوال اچھالا لیکن جواب کون دیتا کہ سب یار تو ساکت تھے اور اس بوڑھے کی طرف نگراں جس کی آنکھوں میں ویسی ہی وحشت تھی جیسے...... جیسے...... دور گاؤں سے حسین حسین کی آوازیں آ رہی ہیں...... شام غریباں شب عاشورہ سے گلے مل رہی تھی...... حسینؑ کے خیمے میں سپاہی کس تھے اور وحشت زدہ......"

مگر ایک زینبؑ تھیں جنھوں نے اس وقت بھی امامؑ کی جلائی ہوئی شمع اپنے بازوؤں کے سہارے روشن رکھی۔

بوڑھے نے کانپتے ہاتھوں سے وہ ہانڈی جس میں آگ روشن تھی آہستہ آہستہ اٹھائی اور اتنی حفاظت اور احترام سے سر پہ رکھی جیسے یہ مقدس آگ اس کے نجات کا واحد ذریعہ ہو۔

"یار حسین یہ کدھر بڑھ رہا ہے؟ تم دیکھ رہے ہو؟" میرے دوست نے مجھ سے سرگوشی کی۔ اور میں سر ہلا کر چپ ہو گیا۔ گاؤں سے گذرتی ہوئی یہ پرسکون ندی جو اس مقام پہ ہاتھی ڈوبانے کی طاقت رکھتی ہے...... جھٹپٹے کے سمٹے دھندے میں کھوئے ہوئے گاؤں کے چوک سے بلند ہوتی ہوئی حسین حسینؑ کی آوازیں...... سورج کا سرخ تھال جو ٹھنڈ منڈ درختوں کے بیچ جھاڑیوں میں اپنے لہو میں نہائے آدمیوں کا نشان...... ٹکڑے ٹکڑے مکانات کے بطن سے پیدا ہوتا ہوا یہ بوڑھا...... یہ ہزار

مشکل جلائی ہوئی یہ آگ ..... آگے دور دور تک پختہ مکانات کی صف .....
اور لرزتا کانپتا ہوا یہ بوڑھا ....."

"یار! مارچ کا یہ مہینہ اور اس کے سر پر مشکل جلائی ہوئی یہ آگ؟" میرا دوست پھر سرگوشیاں کرتا ہے۔

"کسی نہ کسی کو تو یہ ظاہر کرنا تھا بھائی!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن یار! یہ تو خود گرتی عمارت ہے!"

میں چپ رہا، کر بھی کیا سکتا تھا کہ میرا مقدر تو ہمیشہ تماشا رہا، کئی بار جی چاہا کہ میں خود بھی کسی تماشے کا مرکزی کردار بن جاؤں لیکن کبھی سیاہیوں نے ڈرایا۔ کبھی سرخیوں نے ——— اور اب پھر ایسا ہی ایک منظر درپیش ہے!

میں پھر مناظر کے اُس لمحاتی حسن میں گم ہو جانا چاہتا ہوں جو کچھ لمحوں پہلے میری پناہ گاہ تھا لیکن ابھرتے ہوئے چاند کی کم کم روشنی میں بارش کے قہر سے ڈھے ہوئے ان مکانات کی چھ چور دیواروں کی مٹیوں پہ کچھ سائے لرزے اور میں اس حادثے کے امکانات سے کانپ گیا۔ جس کی بے نام شناسائی میرے دل کی منڈیروں پہ اپنے پنکھ پھیلائے بہت نیچے نیچے اڑتی ہوئی میرے قریب آ رہی تھی۔

کیا ہے؟ آخر کیا ہے؟ صدیوں کی کہنہ شکستہ اداس بے نوا مٹی میں اب کیسی حرکت؟

میں کانپ رہا ہوں، میرے دوست اپنی اپنی باتوں میں گم ہیں۔ میں خوف کی شدت سے اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر سختی سے دباتا ہوں۔

"کیا ہوا؟" وہ میری طرف مڑتا ہے۔ میں ڈرتے ڈرتے اُس ٹیلے کی طرف اشارہ کرتا ہوں جس کی منوں مٹیوں کے اندر سے پہلے بال، پھر سر، پھر تازہ کھلا ہوا شگفتہ چہرہ، پھر بازو، پھر اوپر کا دھڑ اور پھر پورا جسم برآمد ہو رہا ہے۔

میں دوست کو دیکھ رہا ہوں اس کا چہرہ سیاہ ہے، وہ میری طرف دیکھ رہا ہے، شاید میرے چہرے کا بھی یہی عالم۔ پھر ہم دونوں اس طرف دیکھتے ہیں،

جہاں چاند کی کم کم روشنی میں سیلاب اور بارش کے قہر سے ڈھے ہوئے ان مکانات کی چور چور دیواروں کی مینڈوں پہ کچھ سائے لرز رہے ہیں .... اور یہاں ہم دونوں کانپ رہے ہیں!

ہمارے دوسرے دوست قہقہے لگا رہے ہیں اور اُس دیہاتی لڑکی کی طرف جملے پھینک رہے ہیں جو کلہاڑی سے درخت چیر رہی ہے اور ہم دونوں گھسٹ گھسٹ کر چلتے ہوئے منظروں کی ان ساری ظاہری کیفیات کے حصار سے آزاد ایک الگ حصار کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔

اور اب ہر منظر سر کے بل کھڑا ہو گیا ہے۔

گاؤں سے گذرتی ہوئی یہ پرسکون ندی ہاتھی ڈبو رہی ہے ....

جھاڑیوں میں پھنسا ہوا، اپنے لہو میں نہایا ہوا انسان سرخ آنکھوں سرخ ہونٹوں، سرخ ہاتھوں اور سرخ پیروں سے چلتا ہوا آہستہ آہستہ ہماری طرف چلا آ رہا ہے .... جھینگے ٹرّا رہے دھند میں گھٹے ہوئے گاؤں میں آگ لگ گئی ہے .... سارا کچھ جل رہا ہے .... آگ کی لپٹیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہیں اور منوں مٹی کے بطن سے جنم لینے والا وہ شگفتہ چہرے والا فرشتہ اپنے دھیرے اور گمبھیر قدموں سے خام مکانات کی سرحدوں سے آگے بڑھ رہا ہے ...... بوڑھا اس سے کچھ آگے سر پر وہ مقدس آگ لئے کچھ آہستہ اور کچھ تیز قدموں سے پختہ مکانات کی طرف بڑھ رہا ہے ...... پھر نوجوان کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور وہ تیز تیز چل کر بوڑھے کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کے قدموں میں جھک کر سجدۂ تعظیمی ادا کرتا ہے

بوڑھے کے چہرے پر اطمینان کی لہریں دوڑ گئی ہیں جیسے وہ اسی کا منتظر ہو۔

اور پھر وہ اپنی روشن کی ہوئی آگ اس نوجوان کے ہاتھوں میں منتقل کر دیتا ہے ——

اپنی آگ نوجوان کے حوالے کرتے وقت بھی اس کی آنکھیں پختہ عمارتوں کی جانب ہیں اور نوجوان ایسے سر ہلا رہا ہے جیسے کچھ سمجھ گیا ہو۔

بوڑھا اسی شکستہ کھنڈر کے پاس ٹھہر گیا ہے اور نوجوان شہر کی طرف جانے والی شاہراہ پر آگے بڑھ رہا ہے جدھر پختہ عمارتیں ہیں ——

اور اسی وقت میرا دوست مجھے بائیں طرف متوجہ کرتا ہے جدھر کالج ہے ادھر بھی خام مکانات کے سائے ہیں ایک بوڑھا منوں مٹیوں کے بطن سے جنم لینے والے ایک نوجوان فرشتے کو اپنی روشن کی ہوئی آگ بخش رہا ہے۔

پھر میرا دوست دائیں طرف متوجہ کرتا ہے جدھر گاؤں ہے ......"

پھر سامنے جدھر سورج کا سرخ تھال اپنے لہو میں نہائے آدمی کا نشان ......"

پھر پیچھے جدھر وہ شاہراہ جس سے گذر کر ہم یہاں تک پہنچے ......"

اور اب مناظر کا سارا ظاہری حسن قطعی طور پر ختم ہو چکا ہے ——

شہر کی طرف جانے والی سڑک پر آگ لئے ہوئے آگے بڑھتا ہوا نوجوان پختہ عمارتیں اور کارخانے اور ہسپتال اور ڈاک خانے اور یہ اور وہ ......"

اور کالج کی طرف جانے والی سڑک پر آگ لئے ہوئے آگے بڑھتا ہوا نوجوان ..."

اور گاؤں کی طرف ..... اور سامنے جدھر سورج کا سرخ تھال ......

اور پیچھے جہاں سے ہم گذر کر یہاں تک آئے ...... ہر طرف نوجوان .... منوں مٹی کے بطن سے جنم لینے والے فرشتے .... جو بوڑھے کی روشن کی ہوئی آگ اپنے سروں پر اٹھائے آگے بڑھ رہے ہیں ....." اور کلہاڑی لئے ہوئے وہ لڑکی جو میرے دوستوں کیلئے صرف "تفریح" کا مرکز ہے

اور بوڑھا جو شکستہ کھنڈر کے پاس کھڑا مطمئن انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا ہے۔

اور کھنڈر جس کی منوں مٹی کے بطن سے پل پل میں شگفتہ چہروں والے فرشتے جنم لے رہے ہیں — اور دور گاؤں سے حسین جبین کی آوازیں .... مشعلوں کی روشنی .... شاید نعرے لگا کر کے ساتھ روانہ ہو چکے ہیں .... بھالے برچھیاں نیزے تلواریں اور ڈھالیں مشعلوں کی روشنی میں چمک رہی ہیں ...." ہم شہر کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں ——

اور سامنے پیچھے وہ قافلہ ہے جو بس اب شہر میں داخل ہونے والا ہی ہے ——

مُنادی

اب تو ہر شخص انکار کرتا ہے کہ "نہیں صاحب! ہم نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ فلاں صاحب نے کہا تھا کہ پکارنے والا پکار کر آگے بڑھ چکا ہے"۔ اور جب فلاں صاحب کے پاس جائیے تو وہاں بھی وہی جواب کہ "نہیں صاحب ہم نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ فلاں صاحب نے کہا تھا کہ پکارنے والا پکار کر آگے بڑھ چکا ہے"۔

لیکن الزام سے بچنے کی ان ساری کوششوں کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک شخص سبز لباس سے اپنا تن چھپائے ہوئے ٹین کے اس گھوڑے سے نیچے کودا جو اسے کوڑھی زنگت انسانوں نے تحفے کے طور پر دیا تھا۔

اور پھر راوی یوں کہتا ہے کہ چشم زدن میں ٹوٹ ٹوٹ کر پانی برسنے لگا۔ طوفانِ نوح سے بھی بڑا طوفان آچکا تھا، ہر طرف پانی ہی پانی۔ طوفان چھتوں کو اڑا کر انجانی سمتوں کی جانب پھینک رہے تھے اور راستے

مولدل، دریا اور بھنور بن چکے تھے۔ سب لوگ اپنے اپنے چھت کے مکانوں میں سہمے بیٹھے تھے کہ سڑکوں پر ہواؤں کے دوش پہ ایک شخص نے ڈنگی بجائی۔

"ملک خدا کا، حکم بادشاہ کا آج رات کے بارہ بجے جہازوں کے بادبان کھول دیے جائیں گے جو جو صاحبان سیلاب سے بچنا چاہیں بارہ بجے سے پہلے پہلے جہاز پر سوار ہو جائیں۔ ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ....." اور تب پھر یوں ہوا کہ لوگ اسی طوفان، بارش اور اندھیری رات میں جہاز کی طرف چل پڑے۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں گھٹا ٹوپ اندھیارا، بارش اور طوفان، گلیوں اور سڑکوں پر ہر طرف پانی ہی پانی اور اس میں دوڑتے اور بھاگتے ہوئے خوف زدہ قدم، میں خود بھی انھیں دوڑنے والوں میں شامل تھا اور اس لئے اس طوفان کی کرشمہ سازیوں سے کچھ زیادہ واقفیت رکھتا ہوں، میں نے مکان سے نکلتے ہوئے اپنی بیوی اور بچوں کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ بیوی کا برقعہ تو دروازے سے نکلتے ہی دو میں سے ٹکراتی ہوئی بارش نے نہ جانے کیسے اس کے جسم سے الگ کر دیا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ساری رہ گئی تھی اور جب وہ گھر سے تھوڑی دور چلی تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہم میں سے کسی کے پیر میں چپل نہیں ہے اور پھر جب ہم اس سے ذرا اور آگے بڑھے تو اچانک بیوی کا بلاوز بھی کہیں گم ہو گیا اور جب ہم جہاز کے زینوں پر چڑھ رہے تھے تو میری بیوی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا جسم چھپانے کی کوشش کرنے لگی اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ ہمارے دونوں بچے ہمارے ساتھ نہیں ہیں اور جب میں جہاز پر چڑھ گیا تو میں بالکل اکیلا تھا اور تب مجھے بابا کی یاد بہت شدت سے آئی جو آخری لمحوں تک ہم لوگوں کو سمجھاتے رہے "طوفان رُکے گا، گلیاں سوکھیں گی اور تب ہم دوبارہ اپنے مکانوں کی چھت اور چھپر درست کر لیں گے۔" اور جس لمحہ میں نے واپس ہونا چاہا ٹھیک اسی لمحہ بادبان کھول دیے گئے اور میں حیرت و حسرت سے اس نئے نوح کو دیکھ رہا تھا جس نے ہم سب کو محفوظ کرنے کے بجائے غیر محفوظیت کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا ایک لمحہ کے لئے مجھے یہ احساس ہوا کہ ہم لوگوں کو بیوقوف بنایا گیا

ہے مگر ٹھیک اُسی لمحہ فوجی دُھن بجنے لگی اور سبز لباس سے اپنا تن چھپائے ہوئے ٹین کے گھوڑے پر سوار ایک ایک شخص آگے بڑھا اور نصیحت کرنے کے انداز میں ہم لوگوں کو سمجھانے لگا۔

"ہم اُس کنارے کو بہت دور چھوڑ آئے ہیں، اس کنارے کی لہریں اور ساحل دونوں ہمارے دشمن تھے۔

میں اُس کی تقریر سنتے سنتے آہستہ سے اُس کے قریب گیا اور اُس کے گھوڑے پر انگلی ماری تو اُس میں سے ٹن ٹن کی آواز آئی۔

"دھت تیری کی۔ اندر سے بالکل خالی ہے۔"

میں نے چاہا کہ اُس سے پوچھوں۔ "دوست! سمندر کی کس لہر کو کس لہر سے الگ کرو گے؟ مگر غالباً میرے اس ارادے کو میرے بغل میں کھڑے سبز عمامے والے نے بھانپ لیا اِس لئے کہ وہ مجھے گھور کر دیکھنے لگا تھا۔

اور اچانک بابا میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے، ان کا جھریوں بھرا چہرہ، رعشہ زدہ ہاتھ اور پیاسے لبالب آنکھیں مجھ سے پوچھنے لگیں۔

"سمندر کا ماحصل اگر شیشگی ہی ٹھہرا تو آنگن کا پانی کیا بُرا تھا؟"

میں نے کچھ جواب دینا چاہا تو وہ پھر مجھ سے پوچھ بیٹھے۔

"تم تو پڑھے لکھے ہو مصنوعی بارش کا مطلب سمجھتے ہو کہ نہیں؟"

میں نے پھر کچھ جواب دینا چاہا تو وہ پھر مجھ سے پوچھ بیٹھے۔

"تم روٹی کے اس ٹکڑے کو بھول جاؤ گے جس کا ایک ٹکڑا تم نے کھایا تھا اور ایک تمہاری اُس بہن نے جو تمہارے بابا کے بازوؤں میں پڑی سسک رہی ہے، تم اتنا پریشان کیوں ہو؟ تم بار بار یہ کیوں سوچتے ہو کہ تم نے گھر کی دیوار پہ عشق پیچاں کی جو بیلیں لگائی تھیں۔ نہ جانے وہ اس بارش اور طوفان میں صحیح و سالم بچیں یا بہہ گئیں، تم سمجھتے ہو کہ ٹین پر بیٹھا ہوا شخص تمہارا خلیہ ہے تو پھر

دیکھی تم اُس کا گھوڑا ٹھٹھکا کر کیوں دیکھ رہے تھے؟

میں ان ساری باتوں کا بہت کچھ جواب دینا چاہتا تھا مگر اُسی وقت اعلان ہوا کہ ہم دوسرے کنارے پر پہونچ چکے ہیں اور جیسے ہی جہاز دوسرے کنارے پر لگا ہم بھیڑ یا دھسان کی طرح اُترنے لگے، اُس کنارے کے لوگ مردم پیشہ تھے، ان کے مکان چھوٹے مگر خوبصورت ہوتے تھے، انھوں نے اچانک جو اتنے سارے لوگوں کو اترتے دیکھا تو گھبرا گئے اور اس پر ستم یہ ہوا کہ ٹین پر سوار شخص چند ہی لمحوں بعد نہ جانے کن خلاؤں اور دھندلکوں میں کھو گیا اور پھر یوں ہوا کہ جنت اور جہنم دونوں ایک دوسرے خلط ملط ہو گئے، ٹوٹنے اور بکھرنے کا سلسلہ تو اُسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب ہم نے اپنے دروازوں پر الوداعی نظر ڈالی تھی مگر صرف ایک امید تھی کہ جانوں کا یہ زیاں لمحاتی ہے اور اگلی قبریں جنت کی کھڑکی کھولے ہمارا انتظار کر رہی ہیں مگر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کوئی قبر کھودنے پر تیار نہیں ہے اور جتنے گورکن تھے سب نے اپنے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں ہم بہت چکر میں پڑے کہ آخر اب کیا ہوگا؟ اور تب ہم لوگوں نے یہ طے کیا کہ بہر حال دوسروں کی قبروں پر قبضہ کرنا ہی ہوگا تو پھر ہم نے یہ کیا کہ دوسروں کی قبریں کھود کھود کر زبردستی ان قبروں میں گھسنے لگے اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی پورا قبرستان کھود ڈالا گیا تو بابا یوں بھی ہوتا ہے کہ پلاسٹک سرجری کے ذریعہ چہرے بدل دیے جاتے ہیں، آپریشن کے ذریعہ دلوں کی ہیرا پھیری ہوتی ہے اور یہ بھی تو آپ نے سنا ہوگا کہ کچھ مصوّر ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک چیز کا ہو بہو نقشہ دوسری جگہ اتار دیتے ہیں۔

نفسیات کا یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے، ان مسئلوں کی تہہ میں جہاں ایک چیز سے محبت کا جواز پیدا ہوتا ہے وہیں دوسری چیز سے نفرت کا بھی جواز پیدا ہوتا ہے۔
ہم لوگوں کے ساتھ بھی یہی ہوا، ہم نے اپنے گھر اپنے پہلے گمشدہ دروں والے گھروں کی طرز پر تعمیر کیے، ہم نے اپنے قدموں کے نشان بالکل اسی انداز میں

ثبت کئے جیسے ہم اپنی گلیوں میں ثبت کیا کرتے تھے اور دوسری طرف ہم نے اس کنارے کی ہر چیز کو یوں سمجھا جیسے ...... جیسے ...... جیسے ......"

"بابا! ہم لوگوں کے پڑوس میں جو ایک جاہل اور اجڈ سا لڑکا رہتا تھا وہ وہیں ہے یا کہیں چلا گیا؟

زندگی کے بعض دکھ بڑے پیارے ہوتے ہیں اور بعض بڑے دکھ دائی۔ ہم لوگوں نے واقعی بھیک کھایا بابا۔ ہم نے تو سمجھا تھا کہ ہم لرزتے پتوں کی طرح کانپتے انسانوں کو ممتا کی گود میسر ہوگی لیکن یہاں آکر احساس ہوا کہ ......"

ج۔ کس نیاموخت علم تیر از من

اور پھر جب ہم نے دیکھا کہ بادل پھر امڈ گھمڈ کر برسنے کی تیاری کر رہے ہیں تو ہم نے ہواؤں کو پیغام بھیجا تاکہ کم از کم اب کے تو سمندر کا حصل تشنگی نہ ٹھہرے مگر وہاں سے جواب آیا: "جاگتا سنسار سوتا پاک پروردگار!" اس کہانی کی تکمیل کب ہوگی بابا کہ "ایک سردار اپنی پیٹھ پر گیہوں کی بوریا رکھ کر ایک ضعیفہ کے یہاں پہنچانے جا رہا ہے اور جب اس کا ذکر وہ بوریا اپنے کاندھوں پہ رکھنا چاہتا ہے تو وہ پوچھتا ہے ــــــ

"تم کہاں کہاں میرا بوجھ ڈھوؤگے؟"

اب تو سنتے ہیں کہ جب کسی گھر پر آواز لگائی جاتی ہے تو دو خالی ہاتھ باہر آتے ہیں اور ان سے قطرہ قطرہ خون ٹپکنے لگتا ہے تو دراصل یہ سب اس کہانی کے مختلف پہلو ہیں اور آخری پہلو یہ ہے کہ جب بادل گھنیرے ہوتے گئے، ہوائیں سرد ہوتی گئیں اور طوفان کے قدموں کی آواز آہستہ آہستہ قریب تر ہوتی گئی تو ہم نے پچھلے دنوں کی یاد میں اپنے دروازے بند نہیں کئے تاکہ پکارنے والا جب پکارے تو آوازیں دروازہ بند دیکھ کر لوٹ نہ جائیں ہم انتظار کرتے رہے ...... کرتے رہے ...... اور پھر بارش شروع ہوئی، طوفان آیا، پانی گلیوں اندر گلیوں سے ہو کر گھروں میں گھسنے لگا، ہم ڈوبنے لگے، دلدل میں دفن ہونے لگے، ہماری صورت یہ

تھی کہ ہم سیلاب میں گردن تک ڈوب جانے کے بعد بھی دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ شاید پکارنے والا اب پکارنے کے بجائے کشتیاں ہی لے کر آئے مگر اب کے وہ یمن کے گھوڑے والا بھی نہیں آیا اور پھر جب ہم میں سے آدھے جانوں کے زیاں کا احساس اپنی آنکھوں میں اجاگر کر بیٹھے تو ایک دن اچانک پکارنے والے نے پکارا ..... "ملک خدا کا حکم بادشاہ کا، جو گھر سے باہر نکلے گا اُسے گولی مار دی جائے گی ..... ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ!" اس اعلان کے بعد تو ایسا محسوس ہوا جیسے اب کے ہمارے مکانوں کی چھت اُڑنے کے بجائے ہم لوگوں کے سروں پر ہی آگری ہے، ہم بہتے ڈوبتے اور تباہ ہوتے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں میں لڑ رہے تھے اور مستقبل کے بارے میں دور دور تک اندھیاروں کی مسافت طے کر رہے تھے اور اس مسافت نے ہمیں ہمارے گھروں کی نالیوں سے چوہوں اور بلیوں کی طرح باہر نکالا اور ہم سیلاب میں بہتے ہوئے انجانی منزلوں کی جانب روانہ ہو گئے ..... ہم بہتے رہے ..... ڈوبتے رہے ..... ابھرتے رہے ..... ٹوٹتے رہے ..... بکھرتے رہے .....

اور جب ہمارے جسموں نے اپنا غیر اختیاری سفر ختم کیا تو ہم نے محسوس کیا کہ ہم پھر پہلے کنارے پر واپس آچکے ہیں، ہم سب کو عجیب سی فرحت کا احساس ہوا، جی چاہا کہ اُس ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرنے لگیں جو دوبارہ اپنے جنگل میں واپس آیا ہو مگر ٹھیک اُسی وقت ہمیں گھیرے میں لے لیا گیا۔

"دشمن ..... دشمن!" ہر ایک جانب سے یہی آوازیں آرہی تھیں۔

ہم جانوروں کے ریوڑ کی طرح ایک جگہ باندھ دیئے گئے، ہم نے ان لوگوں سے اپنے گذرتے موسموں کا حال پوچھنا چاہا مگر اُن کی آنکھوں میں نفرت اور اجنبیت کے خونخوار درندے جبڑے کھولے کھڑے تھے اور جب ہم نے مجبور ہو کر پھر ہواؤں پیغام بھیجا کہ "جس قبر میں تم ہمیں لے گئے تھے اب اُس کے علاوہ ہمارا کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں، اپنے پکارنے والے کو بھیجو کہ ہم جہازوں کے منتظر ہیں!"

اور تب بہت دنوں تک انتظار کرنے کے بعد ایک دن سنگیتوں کی ڈک نے ہواؤں کا پیغام نشر کیا ـــــ

" ملک خدا کا، حکم بادشاہ کا! ہمارا کوئی آدمی اُس کنارے نہیں گیا ہے ..... ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ ......"

پھر کچھ دنوں بعد دوبارہ سنگیتوں نے ہواؤں کا پیغام نشر کیا ـــــ

" ملک خدا کا، حکم بادشاہ کا! اُس کنارے پر بسے ہوئے لوگوں میں سے ہم چن چن کر لوگوں کو اِس کنارے پر لائیں گے ...... ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ ۔

گویا کچھ لوگ بہرحال دو کناروں کے بیچوں بیچ لہروں پہ تیرتے رہیں گے؟

تو اے دونوں کناروں پہ رہنے والو! عبرت ناک بشارت (؟) ہے تم لوگوں کے لئے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب زریلی سرزمینوں کے دونوں کناروں پہ رہنے والوں کی طرح تم بھی بیچوں بیچ لہروں پہ تیرتے رہنے والے ان انسانوں کے رحم و کرم پہ زندہ رہو گے اور مٹی کے گھوڑے پہ سبز لباس پہنا کر اس شخص کو بھیجنے والے کوڑھی رنگت انسانوں کو ٹوٹے اور بکھرے ہوئے ان تمام جسموں کے ایک ایک حصے کا خراج ادا کرنا پڑے گا اور بکانے والا بکارے گا"

" ملک ہمارا حکم ہمارا .... ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ!!

لخت لخت

ایک پرانی شکستہ حویلی کے کھنڈرات میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

حویلی کا بیرونی حصہ "کسی طور" محفوظ" کہا جا سکتا ہے کہ چاروں طرف کی دیواریں ابھی قائم ہیں، گو کہ اُن پر بھی کائی جم گئی ہے اور سبزہ نے گھر بنا لیا ہے اور برسات جب آتی ہے تو حویلی والے بس اسی دیوار کو دیکھتے رہتے ہیں کہ یہی تو واحد پردہ ہے ––– اندر جو کچھ بھی ہوتا ہے، یہ دیوار ہی اندر کے اس ہونے والے "سب کچھ" کو لوگوں کی نظروں سے چھپائے ہوئے ہے۔

لوگوں کا کہنا ہے، کہ یہاں پہلے بہت کچھ تھا، لیکن اب کچھ بھی نہیں ہے، اب صرف حویلی کے چاروں طرف دیواریں ہیں اور دیوار سے گھرا ہوا ایک بہت بڑا اونچا نیچا، کچلا، اور ترکھا بڑا میدان ہے اور اس میدان کے بیچ ایک حویلی جو پہلے کبھی "محل" ہو گی، لیکن اب صرف حویلی رہ گئی ہے حویلی میں ابھی بھی بڑے بڑے کمرے اور ہال ہیں جو [illegible] کل و صو[illegible]

اور ایک کمرے میں وہ، اور ایک کمرے میں وہ رہتا ہے، اور روز اندھیرا ہو جانے کے بعد ایک کمرے سے وہ اور ایک کمرے سے وہ نکلتا ہے، اور بیچ والے کمرے میں دونوں داخل ہو جاتے ہیں۔

بیچ والا کمرہ، جہاں وہ رہتا ہے۔

اس بیچ والے کمرے میں آنے سے پہلے دونوں اپنے اپنے کمرے میں پڑے سوال و جواب کرتے رہتے ہیں۔

آج بھی وہی سلسلہ جاری ہے۔

"ہو بھائی؟"

"ہاں بھائی! اب تک تو ہوں۔"

"اٹھو گے؟"

"اٹھنا ہی پڑے گا۔"

"کیا وقت ہو رہا ہے؟"

"وقت سے ہمیں کیا مطلب بھائی؟"

"پھر بھی!"

"اتنا ہی کافی ہے کہ اندھیرا ہو چکا ہے۔"

"آخر ایسا کیوں ہے بھائی؟ دن سورج ہماری روشنی کیوں لے لیتا ہے؟ رات سے ہمارا کیا رشتہ ہے؟ ہم یہ سب کیوں کرتے ہیں؟ یہ سب کچھ کب تک چلتا رہے گا؟ سو رہے ہو بھائی کہ جاگ رہے ہو؟"

"جاگ رہا ہوں اور سن بھی رہا ہوں۔"

"پھر میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"آج تک یہاں کسی بات کا جواب بھی ملا ہے؟"

دوسرا اس "جوابی سوال" پر خموش رہتا ہے۔ پھر بہت دیر تک دونوں اپنی اپنی پلنگ پر پڑے رہتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ دونوں اپنے بدن سے چادر ہٹاتے ہیں۔ بہ یک

وقت دونوں اٹھ کر بیٹھتے ہیں، پلنگ سے پیر نیچے لٹکاتے ہیں اور اب دونوں نے ساتھ ہی پلنگ چھوڑ دی ہے۔ سامنے میں گہرا دبیز اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ مہینے کی آخری تاریخیں ہیں، اس لئے چاند بھی اپنا سفر پورا کر چکا ہے اور جو بھی آدھا ٹکڑا چاند بچا ہوا ہے، اُسے بھی بادلوں نے گھیر رکھا ہے، لیکن اس اندھیرے میں دونوں اس طرح چل رہے ہیں، جیسے روشنی میں ہوں۔ سامنے رستے جیسے ان کے جانے پہچانے ہوں، یا صدیوں سے ان کے قدم ان رستوں کی پیمائش کر رہے ہوں، اور ان رستوں کے سامنے نشیب و فراز ان کے وجود کا ایک حصہ بن چکے ہوں۔

سچ مچ ایسا ہو یا نہ ہو، لیکن ان کی رفتار..... تھکی تھکی رفتار یہی بتاتی ہے کہ یہ سفر اُن کے من سے شروع ہوتا ہے اور اُن کے من پہ ختم ہوتا ہے۔

اب دونوں ساتھ چل رہے ہیں۔

چلتے چلتے دونوں رُک جاتے ہیں، یہ ایک بڑا ہال ہے، جس میں پرانے زمانے کی کچھ کرسیاں اور سامان ہیں، کمرے کے چاروں طرف بڑے بڑے دریچے ہیں۔ پہلا، دریچے کے پاس کھڑا ہو کر باہر کی طرف دیکھنے لگتا ہے اور دوسرا، کمرے کے بیچوں بیچ گہرے اندھیرے کا جزو بنا کھڑا ہے اور بڑبڑا رہا ہے۔

"وہ لوگ بھی کیا لوگ تھے؟ ایسے ایسے محل بنا کر چلے گئے، کہ دُنیا کا ہر سُکھ اُس کے اندر موجود تھا۔

"تم جانتے ہو نا؟" اس کے دریچے کے پاس کھڑے ہوئے آدمی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ دیوانِ عام تھا، یہاں وہ بیٹھ کر دوسروں کی فریاد سُنا کرتے تھے۔ فرغل بھاری بھرکم لمبی چوڑی ٹوپی، عمامے اور تاج پہنے جس دم تخت پر وہ بیٹھتے تھے تو تاج کا نگینہ پورے ایوان کو روشن کر دیتا تھا۔ یہاں پر وزیر اعظم کی مسند تھی، یہاں پر امیر الامراء کی مسند اور یہ ملکہ کا تخت تھا....."

دریچے کے پاس کھڑے ہوئے آدمی کے چہرے پر ایک اُداس مسکراہٹ پھیل گئی، وہ کھڑکی سے باہر اندھیروں میں، لگاتار دیکھے جا رہا تھا، جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔

دوسرا مسلسل بڑبڑا رہا ہے۔

"اس پورے محل کے منقش در و دیوار اپنی خوبصورتی، نفاست اور انفرادیت میں بے نظیر تھے۔ اس ہال کے گوشے گوشے پہ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ فرش پر نرم گداز قالین بچھے رہتے تھے، جن پر پاؤں رکھنے سے احساس ہوتا تھا جیسے پیروں کے نیچے مخمل یا کسی خوبصورت اور نازک ترین عورت کا رخسار آ گیا ہو۔ پھاٹک پر وردیاں پہنے مؤدب اور چاق و چوبند دربان رہتے تھے اور احاطے میں داخل ہونے کے بعد محل تک پہنچنے کیلئے روش پر سرخ بجری بچھی رہتی تھی، جس پر سے لوگ چرمر چرمر کرتے آتے تھے اور جاتے تھے۔ محل کے دائیں جانب "چمن" تھا، جس میں گلاب، بیلا، نرگس، لالہ اور سوسن کے پھول کھلتے تھے اور رات آتے ہی رات کی رانی ہر طرف خوشبو ہی خوشبو بکھیر دیتی تھی، باغ سے ذرا پرے چھوٹے چھوٹے خوبصورت تالاب تھے، جہاں شہزادیاں شام سویرے لہروں کا تموج دیکھتی تھیں۔ سارے میں شمعیں اور قندیلیں تھیں جو شام ہوتے ہی روشن کر دی جاتی تھیں اور سارے کے سارے میں ایسی دودھیا روشنی پھیل جاتی تھی، جیسے ساون بھادوں کی چودھویں رات میں بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے کے بعد اچانک سارے آسمان سے کہیں دور ... بہت دور چلا جاتا ہے اور سب کچھ دھلی دھلائی چاندنی میں نہا جاتا ہے۔ دن روزِ عید اور رات شب برات تھی۔ ہر طرف چہل پہل، ریل پیل، نوکر چاکر، مالی موالی، آج فلاں کی دعوت، آج فلاں تقریب، آج فلاں تیوہار، بس ہر طرف زندگی..... زندگی..... زندگی ہی زندگی....."

کہتے کہتے رک جاتا ہے جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"یہ کس چیز کی آواز ہے؟"

"کوئی گدھا غالباً میدان میں پیشاب کر رہا ہے" دریچے پر کھڑے ہوئے آدمی نے دھیرے سے جواب دیا۔

"بھگایا کیوں نہ گیا؟"

"کون بھگاتا؟ ہم تو سرِ شام ہی تھک جاتے ہیں۔"

پھر دونوں بہت دیر تک چپ چاپ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ دونوں ہی پر غالباً خیالات سوار تھے۔

"ادھر آؤ" دریچے پر کھڑے ہوئے آدمی نے دوسرے کو آواز دی۔

"دیکھتے ہو؟" دوسرا جب قریب آگیا تو پہلے نے دوسرے کے کاندھے پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے کہا، جیسے بہت تھک گیا ہو۔

"کیا؟"

"اندھیرا!"

"اندھیرا بھی کہیں دکھائی دیتا ہے؟"

"اندھیرا ہی تو دکھائی دیتا ہے، باقی سب کچھ تو دھند میں کھویا ہوا دور کا منظر ہے۔" پہلا بہت دھیرے سے بڑبڑاتا ہے اور پھر اندھیرے میں نظریں دوڑانے لگتا ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے سہارے کھڑے ہیں، جیسے دونوں ہی کچھ محسوس کر رہے ہوں، کچھ تھا جو دونوں ہی نے اپنے اپنے اندر اتار لیا تو جیسے شانت ہو گئے۔

"اب تو وقت ہو گیا ہوگا؟"

"شاید۔"

"چلو چلیں۔"

اور پھر دونوں بیچ والے کمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

بیچ والا کمرہ! جہاں وہ رہتا ہے۔

وہ! جو ایک لاش ہے!!

لاش کا کفن تار تار ہے، بلکہ یوں کہیے، کہ کفن سڑ گل کر تقریباً ختم ہو چکا ہے، کہیں کہیں پر تھوڑا بہت کپڑے کا ٹکڑا باقی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ٹکڑا اسی سڑے گلے کفن کا ایک حصہ ہو، یا پھر ان دونوں میں سے کسی نے ان جگہوں پر کپڑا رکھ دیا ہو۔ بات جو بھی ہو لیکن لاش بے ستر نہیں تھی۔

یہ دونوں لاش کے دائیں بائیں بیٹھ جاتے ہیں۔

دائیں طرف بیٹھا ہوا آدمی کوٹ پینٹ اور شرٹ میں ملبوس ہے۔ ٹائی بھی باندھ رکھی ہے، آنکھوں پر دبیز چشمہ، فرانسیسی انٹلکچوئلس کے انداز میں فرنچ کٹ داڑھی اور مونچھ۔ بائیں سمت بیٹھا ہوا آدمی شیروانی اور شرعی پاجامے میں ملبوس، شرعی داڑھی، مونچھیں ندارد، شریعت غائب، شیروانی کے اوپر علما کے انداز کی قبا، سر پہ لمبا چوڑا عمامہ، بغل میں لاٹھی، ہاتھ میں تسبیح اور پیشانی پہ کثرت نماز سے پڑنے والا نشان۔ لاش کے سر کے بال غائب ہو چکے ہیں، تالو کے اوپر کا حصہ بجبجاتے زخم کا مرکز، کہیں کہیں سے پیپ بھی نکل رہی ہے، پیشانی کے اوپر کا گوشت غائب، سفید سفید ہڈی نمایاں۔ ایک طرف کا کان سڑ کر گر چکا ہے، دوسری طرف کا کان آدھا گل چکا ہے اور آدھے میں چیونٹیاں لپٹی ہوئی ہیں۔ بھوں کا بال غائب، پلکوں کا پتہ نہیں ہے، آنکھوں کی جگہ دو اندھے غار، جن کے اندر چیونٹے چیونٹیاں اور مختلف قسم کے دوسرے رینگنے اور اڑنے والے چھوٹے بڑے کیڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ اڑ اڑ کر اندر جاتے ہیں اور پھر اندر سے بدبودار گوشت کے ٹکڑے لے کر باہر آتے ہیں۔ ناک کی جگہ پر بھی غار ہے اور ناک اور آنکھ کے راستے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چیونٹیاں اڑنے والے چیونٹے، مکھیاں بہت اطمینان سے ناک کے راستے سے اندر جاتے ہیں اور آنکھ کے راستے سے باہر آتے ہیں، ہونٹ گل گل کر ٹپک چکے ہیں اور دانت اپنی جگہ چھوڑ کر حشرات الارض کی غذا بن چکے ہیں۔ گردن سے تلوے تک کہیں پیپ بہہ رہی ہے، کہیں گوشت اُدھڑا ہوا ہے، کہیں سے کالا جما جما خون نکل رہا ہے، ہاتھوں کی انگلیاں اپنے چمڑے چھوڑ کر بدہیئت ہو چکی ہیں اور مڑ مڑا چکی ہیں۔ پیر کا پورا حصہ گوشت سے بیزار ہے، ایڑی آگے کی طرف ہو گئی ہے، اور انگلیاں پیچھے کی طرف۔ پورے جسم پر سانپ بچھو، مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے بہت اطمینان کے ساتھ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ لاش کے اوپر، لاش کے نیچے، لاش کے دائیں بائیں، لاش کے سرہانے اور پائینتی ہر طرف، پیلا پیلا مواد بہہ رہا ہے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے افراد کو چھو چھو کر زمین میں جذب ہو رہا ہے۔ پھر بھی لاش کی مجموعی حالت یہ بتا رہی ہے کہ لاش تھوڑے دنوں کی ہے۔

کمرے کی پوری فضا پُراسرار دھندلکے میں گم ہے اور بدبو سے سارا ماحول متعفن

ہو رہا ہے۔ دونوں بہت دیر سے خاموش بیٹھے ہیں، دونوں ہی کچھ سوچ رہے ہیں، لیکن شاید گفتگو کرنے میں دونوں ہی کے لئے کوئی چیز مانع ہو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد دونوں نے بہ یک وقت ایک دوسرے کی طرف نگاہ کی، آنکھوں میں درد مشترک کی جھلکیاں دکھائی دیں۔

دوسرا پھر بڑبڑانے لگتا ہے۔

"روز وہی کام، سورج غروب ہوا اور چارپائی چھوڑ دو۔ کچھ دیر تک وہ، اور پھر یہ۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ ہم کیوں نہ.....؟"

"شش!" پہلے نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا "دیواریں بھی کان رکھتی ہیں۔"

"تم بزدل ہو!" دوسرا غرّانے لگتا ہے "کیا کر لیں گے؟ مار ہی ڈالیں گے نا؟ یہ روز روز کی مصیبت سے تو بہتر ہے... یہاں لاکر عذاب میں ڈال گئے ہیں..... کمینے..... سالے..... وقت کیا ہو رہا ہوگا؟"

"پتہ نہیں!"

"اب تو سبھی چل چکے ہوں گے؟"

"ممکن ہے۔"

"لیکن ابھی ہیں دور ہی، کیوں کہ آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔"

"ہاں، ایسا تو ہے۔"

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ دونوں ہی کوئی خاص بات کہنا چاہ رہے ہیں، لیکن یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ یہ بات شروع کون کرے؟

"ہٹ سالا!" دوسرا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ تھا غالباً۔ رینگتا ہوا چہرے پر آ گیا تھا۔"

"ٹارچ ہے نا؟"

"ارے ہاں! میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

پھر کمرے میں ٹارچ کی مدھم روشنی پھیل گئی۔

چاروں طرف مٹی ہی مٹی ہے۔ کہیں کہیں سے مٹی اور سپیدی کا چونا بھربھرا ابھر ابھر کر گرتا ہے۔ زمین "چپ چپ" [illegible] ہے۔ کہیں کہیں پر سے سانپ کی پھسکار بھی سنائی دے رہی ہے بیٹھے ہوئے اشخاص کے چہرے سپاٹ ہو رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ان دونوں کو ان حشرات الارض سے کوئی خوف نہیں ہے۔

"ارے یہ کیسے مر گیا؟"

ٹارچ کی روشنی رینگتے ہوئے ایک اژدہے پر ٹھٹک گئی جو مردہ پڑا تھا۔

پہلا اداس دھیمے لہجے میں ہنسنے لگا "اس نے مجھے کاٹا تھا۔"

"ذرا باہر دیکھنا تو"

دوسرا آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولتا ہے۔ ساری حویلی پر سکوت طاری ہے۔ صرف ہوائیں سن سن کرتی آرہی ہیں اور جا رہی ہیں۔ کہیں کہیں سے کتوں اور سیاروں کے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔ حویلی کے میدان میں لگے ہوئے تاڑ کے درخت "ہڑ ہڑ" کرکے بجتے ہیں تو فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ سارے میں عجیب سی بدبو بہہ رہی ہے جو اس پر اسراریت اور ہولناکی میں اضافہ کر رہی ہے۔

باہر کی طرف دیکھتے ہوئے دوسرا بڑبڑانے لگتا ہے۔

"اندھیرا..... اتھاہ گہرا اندھیرا..... اور اس گہرے اندھیرے سے ابھی وہ ابھریں گے..... مشعلیں اور لالٹینیں لئے ہوئے..... وحشی درندے..... دوسروں کی کوئی فکر ہی نہیں ہے..... اپنی بھی فکر نہیں ہے..... بے حس..... بتانا بھی مشکل..... روشنی وقفِ ماتم ہوئی..... روشنی وقفِ ماتم ہوئی....."

"اوہ! آگئے! آگئے!"

پہلے نے اچانک کان کھڑے کئے اور دور سے ہواؤں کے ریلے کے ساتھ آتی ہوئی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔

"ہاں شاید!"

دوسرے نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔

اور پھر دونوں نے خودکار مشین کی طرح کام کرنا شروع کر دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے تھیلے سے مختلف قسم کی چیزیں نکالنی شروع کیں۔ ساری چیزیں جب دونوں کے سامنے ڈھیر ہو گئیں تو ایک نے ٹارچ کی روشنی کا مرکز لاش کو بنایا اور دوسرا کپڑے سے بدن خشک کرنے لگا۔ بڑی بڑی مشکل سے جسم خشک ہوا، اس لئے کہ جہاں پر کپڑے والا ہاتھ پڑتا، وہاں خشکی کی بجائے اندر سے "پیچ" سے نکلنے والی پیپ مزید گندگی پھیلا دیتی۔ کسی نہ کسی طرح جسم خشک ہوا تو ٹارچ کی روشنی سر پر پڑنے لگی اور پہلے نے اپنے تھیلے سے نکالا "وگ" سر پر چڑھا دیا، جس سے سر پر بال بھی نظر آنے لگے، اور رسنے والی پیپ بھی غائب ہو گئی۔ پھر شیشے کی دو گولی نکال کر آنکھوں کے گہرے غار میں فٹ کی گئیں۔ پلاسٹک کی ناک، ناک کے غار کی جگہ چپیاں کی گئی، پیروں پر موزے چڑھائے گئے، ہاتھوں میں دستانے پہنائے گئے۔ جب یہ کام پورا ہو چکا تو تھیلے سے ایک لمبا چوڑا کفن نکال کر دوسرے نے پہلے کی گود میں رکھ دیا۔ پھر چاروں طرف کی زمین صاف کرنے کی مہم شروع ہوئی اور کمرے میں رینگتے ہوئے سارے سانپ، بچھو اور حشرات الارض چوں چوں کر کے چلانے لگے۔

"جلدی کرو" قدموں کی آواز قریب ہوتے دیکھ کر پہلے نے کہا اور دونوں کے ہاتھوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ زمین جانوروں سے صاف ہو چکی ہے۔ اب لاش کو کفن پہنایا جانے لگا۔ اس کام میں دوسرا بھی پہلے کا شریک ہے۔ وہ کفن پہنا رہا ہے اور بڑبڑا رہا ہے۔

"تم... تم... کیسے دم بخود ہو جاؤ گے... یا... سانپ... اور منزہ... وہ آئینہ... اور تم... اور تم... رات بھر کا یہ ہنگامہ... یا یا یا... صبح ہوتے ہی سب کچھ ختم... بس اٹھ بند... تمہارے کمرے میں تالا بند... کوئی یہاں نہیں آسکتا... ہم اپنے کمروں میں مقید... ہم کہیں نہیں جا سکتے... دن بھر آدھے جاگے آدھے سوئے... سب کے منتظر... پھر کل... یہی سب کچھ... ویسے ہی تم... بالکل اصلی!!"

"جلدی کرو، جلدی!" پہلا جھلا کر اور غصہ کر بولا۔ دوسرا اور تیزی سے کام کرنے لگتا ہے، کام بھی کرتا جا رہا ہے اور بڑبڑاتا بھی جا رہا ہے۔

"کیا ہے یہ سب کچھ... عجیب اور متحیّر کن... ناقابلِ یقین... اب کیسے جلدی کروں... لاش سنبھالے نہیں سنبھل رہی ہے... پیر سنبھالنے کی کوشش میں ہاتھ الگ ہو جاتا ہے... ہاتھ ٹھیک ہوتا ہے تو ہونٹ لٹکنے لگتا ہے... تم بھی عجیب ہو... نہ راکھ بن کر بکھر جاتے ہو... نہ پتھر بن کر ڈھیر ہوتے ہو... روز اندھیرے میں نوشتہ بنتے ہو اور دن بھر میں اپنی قبا کو اپنے وجود کا ایک حصہ بنا ڈالتے ہو... تم ہم، وہ... سب ایک سحر کے اسیر... قیدی... سیش محل کے... شب کے مسافر... جنگل میں رستہ بھولے ہوئے... بھول بھلیوں میں گم...

قدموں کی آواز بہت قریب ہوتی جا رہی ہے۔

کسی کسی طرح لاش کو کفن پہنایا گیا، اور تینوں بند باندھ دیئے گئے۔ پھر دونوں لاش کو اٹھا کر سفید دھلی دھلائی چادر بچھا دیتے ہیں اور لاش کو زمین پر لٹا کر تھیلے میں سے نکالی ہوئی کیوڑے اور عرقِ گلاب کی دو بوتلیں بہ یک وقت اس پر انڈیل دیتے ہیں۔ اور لاش پر مخمل کی چادر اڑھا دی جاتی ہے، جس پر رنگ برنگے گل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔

جس وقت لاش کو چادر اڑھائی جا رہی تھی، تو ایک بار پھر دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں ٹھٹک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے... دونوں کے بیچ لاش..... بائیں جانب پہلا... دائیں جانب دوسرا... دونوں خموش... ایک دوسرے کے آمنے سامنے... جیسے دونوں ہی کوئی خاص بات کہنا چاہ رہے ہوں، لیکن یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے ہوں، کہ یہ خاص بات کون شروع کرے۔

باہر بہت تیز چرچراہٹ کے ساتھ حویلی کا پھاٹک کھلنے کی آواز آتی ہے، اور دونوں چونک پڑتے ہیں۔

"جلدی کرو، جلدی کرو" پہلا ہدایت کرتے ہوئے جلدی سے چادر سے سر کو ڈھانپ دیتا ہے۔ سرہانے، پائینتی میں اور دائیں بائیں اگر بتی جلا دی جاتی ہے۔ ایک بڑے

برتن میں ڈھیر سا لوبان اور کافور رکھا ہوا ہے، اس میں انگارے ڈالے گئے، اور اب ساری فضا خوشبو سے معطر ہو گئی ہے۔

آنے والے ورانڈے میں آچکے ہیں ... ڈھیر سارے قدم ... بے صبری سے بڑھتے ہوئے قدم ... یہ دونوں مؤدب انداز میں دوزانو ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اور ایک مرتبہ اچانک دروازہ کھلتا ہے اور ڈھیر سارے لوگوں کا اژدہام کمرے میں در آتا ہے۔

سر ... ڈھیر سارے سر ... ہر ایک کے ہاتھ میں لالٹین، پٹرومیکس، مشعلیں، اور ٹارچیں! ساری روشنیاں بہ یک وقت لاش کے اوپر مرکوز ہو گئیں

سبھی اُچک اُچک کر لاش کو دیکھنے لگتے ہیں ... ایک اژدہام ہے جو لاش کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا ہے اور ایک دوسرے پر گرا پڑ رہا ہے۔

"باری باری سے ... ایک ایک آدمی ... اپنی باری کا انتظار کیجئے ..... دیکھئے بے ادبی نہ کیجئے ... احترام ... احترام!" پہلا لوگوں کو لاش پر گرنے سے روکنے کے لئے بار بار گھگھیا گھگھیا کر درخواست کرتا ہے، لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے!

"ٹھیک ہیں ... ٹھیک ہیں ... بالکل ٹھیک ہیں ... سلامت ہیں ... وہی رعب ... وہی دبدبہ ... وہی شاہانہ انداز ... سب ٹھیک ہے ... خوشبو ... سلامتی ... سب ٹھیک ہے ... سب ٹھیک!!"

بہت ساری آوازیں بہ یک وقت گونجنے لگیں سبھی ناچ رہے ہیں، گا رہے ہیں، خوشی میں مست ہو کر کچھ مخصوص خوش الحان حضرات نے حسبِ معمول پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

"فَبِاَیِّ آلاءِ ربکما تکذّبان"

"فَبِاَیِّ آلاءِ ربکما تکذّبان"

خوشی میں جشن مناتے ہوئے لوگ ... آمنے سامنے بیٹھے ہوئے وہ دونوں ... دونوں کچھ گویا ... کچھ چپ ... دونوں ایک دوسرے سے نگاہوں ہی نگاہوں میں

مخاطب بھی... کش مکش کی کیفیت بھی ... جیسے دونوں ہی کوئی خاص بات کہنا چاہ رہے ہوں لیکن فیصلہ نہیں کر پا رہے ہوں کہ بات شروع کون کرے۔

اور ساری فضا میں اگر بتی، لوبان اور کافور کی خوشبو... اور رقص کرتے ہوئے لب... اور جھوم جھوم کر پڑھی جانے والی آیت....

فبای آلاء ربکما تکذبان

فبای آلاء ربکما تکذبان

دونوں ایک دوسرے کی طرف بے تابانہ دیکھتے ہیں، جیسے دونوں ہی ابھی فوراً ہی کوئی خاص بات کہنے والے ہیں، لیکن دونوں ہی کی نگاہیں پھر فوراً ہی اس انداز میں جھک گئی ہیں، جیسے دونوں ہی اپنے اپنے دل میں شرمندہ ہو گئے ہوں یا دکھی ہو گئے ہوں!!

آتم کتھا

میں بھاگ رہا ہوں اور کتے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔

اور بھاگ کر جاتا بھی کہاں کہ اس وسیع و عریض حصار کو مضبوط کرنے کے لئے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں کہ دیوار کے اس پار والوں کو ادھر کا کوئی حال معلوم نہ ہو سکے اور ادھر کا عالم یہ تھا کہ شہر میں کتے زیادہ تھے اور آدمی کم۔ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ شاید میں ..... شاید وہ ..... شاید تم ..... شاید ہم سب ....."

اور اب سب اپنے ہی تیر کے خود شکار۔ نزدیک و دور نظریں دوڑاتا ہوں تو اندر ہی اندر بہت دور تک ناکامی کی تلخی اور سڑاند محسوس ہوتی ہے میں شہر کے بیچوں بیچ ہوں۔ پھر بھی اندھیرے کا یہ عالم ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا ہے۔ ہانپتا کانپتا اندھیری انجانی دشاؤں کی جانب بھاگ رہا ہوں اور پیچھے تعاقب کرتے ہوئے کتوں کے مسلسل بھونکنے کی

آوازیں آ رہی ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ شہر تو راتوں کو بھی بقعہ نور بنا رہتا تھا۔ پھر آج چاروں اور گھٹا ٹوپ اندھیرا کیوں ہے؟ کیا میں اندھا ہوں؟ یا یہ روشنیاں ہی اندھیروں کی خالق ہیں۔

جواب نہ پاکر اندر ہی اندر کوئی سسکتا ہے، روتا ہے اور میں مسلسل بھاگ رہا ہوں۔

بھاگتے بھاگتے کسی اپنے جیسے وجود سے ٹکرا جاتا ہوں اور خوشی کے مارے چیخ پڑتا ہوں (گو کہ یہ بھی احساس ہے کہ حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی ہے) اس وجود کے پور پور کو چھو رہا ہوں کہ اس اندھیرے میں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور بس!

میرے ہاتھ بے تابانہ اُسے چھو رہے ہیں..... لیکن یہ کیا؟

جیب میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے پیار کرنا چاہتا ہوں تو میرے ہاتھ دونوں طرف سے آکر خود ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور میں خوف سے کانپ اٹھتا ہوں..... ڈرتے ڈرتے پھر سینے سے آگے ہاتھ بڑھاتا ہوں مگر وہاں کچھ نہیں ہے..... صرف شانوں تک کا انسان جس کا سر غائب ہے۔

"بے سر کا آدمی"! میں آہستہ سے بڑبڑاتا ہوں اور بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔

بھاگتے بھاگتے میں پھر اپنے ہی جیسے کسی وجود سے ٹکراتا ہوں اور خوشی میں اس سے لپٹ جاتا ہوں کہ اس سے تو اپنا دکھ درد کہہ سکوں گا مگر جب میری ٹھوڑی اس کے شانوں پر ٹک گئی اور حسب دستور خلا میرا مقدر رہا تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب اس کے ساتھ کیا سلوک کروں؟

اب کے مجھے پہلے کی طرح اتنے شدید خوف کا احساس بھی نہیں ہوا.....

شاید حالات کی کرم فرمائی تھی ——

میرا سفر جاری رہا۔ لوگ ملتے رہے، میں انھیں چھوتا رہا، ہر وجود کا پور پور سلامت ...... صرف سر غائب!

اور تب ایسے میں شیو میرے پاس آئے اور پوچھا "کیوں رے بچّے کچھ دکھائی دیا ہے؟" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مہاراج! کچھ نظر نہیں آتا۔" تو مہاراج بہت زور سے ہنسے اور جاتے جاتے کچھ دیر کے لئے مجھے اپنی تیسری آنکھ ودان دے گئے۔ اور جب تیسری آنکھ کھلی تو کچھ اور ہی منظر سامنے تھا ——

وہی سارے بے سر کے لوگ جن سے میں گزر چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دوکانیں اپنے سینوں میں سجائے گھوم رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو ہر دوکان میں دوکانداروں کے عزیز و اقارب کے کٹے پھٹے اجزا پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا "ان سب کا کیا کرو گے؟" تو جواب میں انھوں نے پیٹ دکھائے۔ میں ان کی مجبوریاں سمجھ گیا اور جب سے چند سکّے نکال کر انھیں دینا چاہا تو انھوں نے پورے جسم کی سرزنش سے انکار کی فضا پیدا کی اور پھر سکوں کی قے کرنی شروع کر دی اور تب میں آہستہ سے وہاں سے کھسک گیا کہ اپنے بس میں اور تھا ہی کیا۔

تو شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بکھرا ہوا میں اور میرے چاروں طرف بے سر کے انسانوں کا اژدحام اور تنے ہوئے سکّے اور پیٹ پر بندھے ہوئے پتھر اور روشنی اندھیروں کی خالق اور بے سر کے لوگوں کی دوکانوں میں ان کے عزیز و اقارب کے جسموں کے کٹے پھٹے اجزا تو ایسے میں میرے سامنے ایک ہی راستہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

میں بھاگ رہا ہوں اور کتّے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔

میں بھاگتے بھاگتے ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہوں جہاں کورو و پانڈو جنگ کا آغاز کرنے والے ہیں۔ دونوں طرف سے تیاریاں مکمل ہیں۔ ایک طرف کورو اور ایک طرف پانڈو —— اور ان دونوں سے الگ ذرا کنارے سے پڑے ہیں!

میں نے اپنا سر ٹٹولا۔ وہ موجود تھا۔ لہٰذا میں نے دونوں میں کسی ایک کا ساتھ دینا چاہا لیکن اب کے کورو پانڈو میں سے حق کس کے ساتھ ہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے اس لئے کہ دونوں طرف بے سر کی فوج ہے۔ سو میں نے آہستہ سے ارجن کو مدد کے لئے پکارا مگر ارجن کے بجائے نارد جی دوڑے آئے کہنے لگے ' ارجن کو کشٹ مت دو۔ وہ خود چکرائے ہوئے ہیں۔" اور یہ کہتے ہوئے نارد نے ایک عینک میری طرف بڑھائی میں نے پوچھا " مہاراج گدھ کی عینک آپ نے واپس نہیں کی کیا؟" کہنے لگے " نہیں نہیں میں نے تو واپس کر دی تھی مگر آدمی کا گوشت نہ ملنے کی وجہ سے اس کی بیوی مر گئی تو وہ عینک مجھے دے گیا کہ اب اس کی اسے ضرورت نہیں تھی۔"

نارد جی نے یہ کہتے ہوئے عینک مجھے لگا دی اور میں حیرت میں پڑ گیا.....

کوروکشیتر کے میدان میں دونوں طرف تنے تھے" آدمی کہیں نہیں تھا میں نے جلدی سے عینک نارد جی کے حوالے کی اور ڈنڈوت کرتے ہوئے کہا کہ " مہاراج! آپ تو چلے ہی جائیے ورنہ آپ اپنے ساتھ میری بھی جان لیں گے!"

نارد مہاراج اپنی عینک لے کر آگے پدھارے اور میں بھی چپکے سے وہاں سے کھسک گیا کہ کسی طرف بھی ٹھہرنے کا کوئی سوال نہیں تھا اب میری صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح اس وسیع و عریض حصار کے آخری سرے تک پہنچوں اور یہ چوڑی دیوار پار کر کے اس طرف سے لوگوں کو مدد کے لئے پکاروں۔ میں بھاگتا رہا کٹے سر اچھلا کرتے رہے۔ کبھی کبھی کچھ کٹے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتے، کوئی پیر پکڑنا چاہتا کوئی گردن پر حملہ کرتا کوئی سر کا نشانہ لیتا، کوئی دل کی طرف تاکتا مگر میں بہتیرے چلتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔ بھاگتے بھاگتے کسی نہ کسی طرح دیوار شہر تک پہنچ گیا۔ اب صرف دیوار پار کرنے کا مسئلہ تھا ———

دیوار کافی لمبی چوڑی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے میری ہمت جواب دے گئی مگر پھر اندر کی صورت حال نے یہ دھمکی دی کہ دیوار نہ بھی پار کر سکے تو کیا اندرون شہر کے یہ کٹے تمہیں چھوڑ دیں گے۔

بات صحیح تھی لہذا میں نے جی کڑا کر کے دیوار پر چڑھنا شروع کیا۔ دیوار چاروں طرف سے سڈول سجل تھی۔ ذرا بھی کہیں کوئی دراڑ نہیں۔ پھسلن ایسی کہ نہ ہاتھ ٹھہرے نہ پیر۔ مگر کتوں کا خوف میری واپسی کے ارادوں کا قاتل تھا۔ لہذا اس بوکھلاہٹ میں کسی نہ کسی طرح دیوار پر چڑھ ہی گیا ——

مگر یہ کسے معلوم تھا کہ دیوار کے اس طرف بھی ایسی ہی صورت حال ہوگی!

اب میں "اس طرف" کی صورت حال آپ کو کیا بتاؤں؟ بس یہی سمجھئے کہ "اس طرف" اور "اُس طرف" کا جملہ ہی جھوٹ کی پیداوار ہے —— دیوار کے چاروں طرف دور دور تک سمندر ..... گہرا آتشیں سمندر ..... اور سمندر سے پرے بڑے بڑے میدانوں میں چاروں طرف کتوں کی فوج آدمیوں پر حملہ آور ..... اور جو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر سمندر میں کود بھی جاتے ہیں۔ انھیں پھر کھولتے کھدکھداتے سمندر سے نکلنا نصیب نہیں ہوتا..... اور دیوار اسی طرح سڈول، سجل اور پھسلن والی ہے۔

میں نے بہت دیر تک اور بہت غور سے چاروں طرف کی اس صورت حال کو دیکھا اور پھر آہستہ سے اپنی ہی طرف اتر گیا ——

اور تب اسی سمئے شیو آ گئے اور کہنے لگے "بچہ آنکھیں واپس کر بڑا سنکٹ کا سمئے ہے آدمی اور کتے کی پہچان مشکل ہو گئی ہے؟؟

اور تب ایسے ہی سمئے میں شنکر اپنا کمنڈل بجاتے، ترشول لہراتے اور مسکراتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "بچہ اس سارے کھیل، کھوٹ، کپٹ اور جھوٹ سے اگر مکتی چاہتا ہے تو وش پی کر امر ہو جا ورنہ کتے تیرا جینا مشکل کر دیں گے۔!

"نہیں مہاراج اس کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے اپنی جیب سے چھری نکال کر اپنا سر اپنے دھڑ سے الگ کرتے ہوئے مسکرا کر شنکر کو جواب دیا۔

جَال

میں ابھی پوری طرح بیدار بھی نہیں ہو پایا تھا کہ وہ مجھے بلانے آ گیا۔ میں نے اس کی آواز نہیں سنی اور نہ ہی اس نے دروازے پر کوئی دستک دی مگر پھر بھی مجھے یہ احساس ہو گیا کہ مجھے کوئی بلانے آیا ہے اور میں نیند ہی میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں ایک دو بار میں نے اس سے پوچھنا بھی چاہا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے اور مجھے کس نے بلایا ہے مگر اس کی رفتار نے مجھے برابر تنبیہہ کی اور میں اس سے کچھ پوچھے بغیر اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ ہر لمحہ مجھ سے دو قدم آگے رہتا اور میں کوشش کے باوجود اس کو چھونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک طویل عرصہ گذر چکا تھا اور ہماری راہوں کے دائیں بائیں لگے ہوئے ملامت کے پودے تناور درختوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ راستہ اس قدر دشوار اور خاردار تھا کہ کہیں کہیں خون بھی نکل آیا اور چراغ بھی جل اٹھے اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ پیاس سے حلق خشک ہونے لگا تو ریت پھانکنا پڑی لیکن یہ ساری صعوبتیں اور مشکلیں میرے لئے تھیں وہ تو ہوا کی طرح بہہ رہا تھا اور سائے کی طرح رینگ رہا تھا۔ میں نے کئی بار اس کو چھونا چاہا مگر ہر بار وہ ہاتھوں میں آ آ کر پھسل جاتا اور میں خجیف ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگتا کہ کوئی اور دوسرا میری ہلس

ناکامی کو دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے کچھ سکون ملتا کہ ملامت کے ان تناور درختوں کے پرے اور بھی بہت سارے لوگ اسی طرح ناکام ہو رہے تھے۔ ویسے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ سارے لوگ بھی اسی آواز پر چل پڑے تھے یا انہیں کسی دوسرے نے بلایا تھا۔

بہر کیف! یہ بات کچھ اطمینان بخش تھی کہ صرف میں ہی اس راہ کا مسافر نہیں ہوں بلکہ اور لوگ بھی میری ہی طرح کسی کے بلاوے پر چل پڑے تھے۔

وہ جس وقت مجھے بلانے آیا وہ رات کا آخری حصہ تھا اور اب کہ پھوٹ رہی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور چاہا کہ اپنے قدموں کے دھندلاتے نقوش کے سہارے اپنے گھر سے آتی ہوئی خوشبو کی کم از کم ایک لہر بھی اپنے سینے میں چھپا لوں مگر میں ایسا نہ کر سکا اس لئے کہ میرے ہر پچھلے قدم پر ایک قد آدم دیوار اٹھتی جا رہی تھی اور یہ دیکھ کر میں بہت گھبرا گیا اور یہ خیال مجھے بار بار ستانے لگا کہ میرے بیوی بچے مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ میں ان سے کہے بغیر چلا آیا ہوں اور ان کی خاطر مجھے جلد ہی واپس ہو جانا چاہئے۔

"اگر اس طرح ہر قدم پر ایک دیوار اٹھتی رہی تو میں گھر کیسے جا سکوں گا"۔ میں نے اس کے شانے پکڑ کر جھنجھوڑے مگر یہ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر ہے اور میرے ہاتھ خلا میں جھول رہے ہیں۔ اس کی رفتار نے پھر خاموش تنبیہہ کی اور میں کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چلتا رہا لیکن گھر لوٹنے کا خیال بار بار مجھے ستا رہا تھا مگر میں یہ سوچ کر خاموش رہ جاتا کہ کہا جائے تو کس سے کہا جائے، کیا کہا جائے؟ کہنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟

کچھ دیر کے بعد سورج طلوع ہو گیا اور روشنی پوری طرح پھیل گئی، میں نے آنکھوں کو مناظر کے تعاقب میں بھیج دیا اور خود اندھوں کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگا۔ صبح کا سہانا وقت کھلتے ہوئے پھول کی خوشبو اور بھاپ بن کر اڑتی ہوئی شبنم کی خنکی ان سارے عناصر نے سفر کو بہت خوبصورت بنا دیا اور اس وقت تو

میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب مجھے سمندر سے گذرنا پڑا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج کا غسل تو سب سے زیادہ شاندار رہا۔ ویسے میں FRENCH BATH لینے کا عادی ہوں مگر جب ٹھنڈا ٹھنڈا پانی کپڑوں کی حدود سے گذرتا ہوا جسم کی جلد اور روؤں سے ٹکرایا تو ایک عجیب سی لذت اور گدگدی کا احساس ہوا۔ اور میں پھر تازہ دم ہو کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ میں اتنا خوش تھا کہ میں پیچھے کی طرف دیکھنا بھی بھول گیا جہاں میرے ہر قدم پر قد آدم دیواریں کھڑی ہوتی جا رہی تھیں اور نہ ہی مجھے اپنے گھر کا خیال آیا جہاں میری بیوی اور بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

مجھے چلتے چلتے بہت عرصہ بیت گیا، سورج کی تمازت اب بڑھنے لگی۔ گھڑی تو سر ہانے چھوٹ گئی تھی لیکن اندازاً گیارہ ساڑھے گیارہ ضرور بج رہے ہوں گے۔ سفر ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا اور منزل لا معلوم اور اس پر ستم یہ ہوا کہ اب ہم لوگ ایک وسیع صحرا سے گذر رہے تھے۔ جلتی اور تپتی ہوئی ریت پر چلتے چلتے میرے تلووں میں چھالے پڑ گئے۔ میرا ایک ایک قدم مشکل سے اٹھنے لگا۔ کبھی جی چاہتا کہ واپس لوٹ جاؤں مگر مشکل یہ تھی کہ میرے ہر قدم پر ایک قد آدم دیوار اٹھتی جا رہی تھی اور بیچ صحرا میں اگر ٹھہر جاتا تو سلگتی ریت کا تنور بھون ڈالتا' اس لئے سوا آگے بڑھنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور آگے بڑھنے کی صورت یہ تھی کہ میں اس کے پیچھے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اور بس!

سورج اب سر پر آ چکا تھا۔ میرا سارا جسم جلتا، سلگتا' اور پکتا ہوا پھوڑا بن گیا' میری رگیں پھٹ گئیں اور ان میں سے خون بہہ بہہ کر ریت پر گلکاریاں کرنے لگا اور میں گھسٹتے قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے رینگ رہا تھا۔ وہ پل پل مجھ سے دور ہوتا گیا۔۔۔۔ دور ہوتا گیا۔ اور آخر کار وہ میری نظروں کے تعاقب سے اوجھل ہو گیا۔ میں ریت کے انگاروں پر پڑا لوٹتا رہا۔ اور انجام کار ایک لمحہ ایسا آیا جب میں آخری بار سسک سسک کر تڑپ تڑپ کر اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"تم کہاں ہو..... تم کہاں ہو۔" پکارتے پکارتے میرا گلا بیٹھ گیا آواز رندھ گئی لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا اور آہستہ آہستہ میری تڑپن بھی ختم ہوگئی میرا سارا خون جسم سے نکل کر صحرا میں پھیل چکا تھا' بدن سرد ہو چکا تھا۔ اور دیدے اپنے حلقوں سے نکل کر تپتی جلتی اور سلگتی ہوئی ریت پر بے چینی سے ادھر ادھر لوٹتے ہوئے نیند میں اٹھ کر ان آنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں نجانے کہاں چلے جا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ پلنگ سے اٹھ رہے تھے' کچھ صبح کی ٹھنڈی ہوا کا لطف لے رہے تھے' کچھ صحرا میں خون سے بنائے ہوئے رستے پر بڑھتے جا رہے تھے۔ اور کچھ اپنے ہر ہر قدم پر اٹھتی ہوئی قد آدم دیواروں کو دیکھ کر اس کا شانہ پکڑ کر اور جھنجھوڑ کر پوچھ رہے تھے۔ "اگر اس طرح ہر قدم پر ایک دیوار اٹھتی رہی تو میں گھر کیسے جا سکوں گا۔"

"سوئے رہو۔ مت اٹھو کوئی لاکھ دروازے پہ دستک دے دروازہ مت کھولو اس سے ڈرو..... اس سے بچو..... وہ قاتل ہے..... وہ قاتل ہے۔" میری ٹھنڈی اور اکڑی ہوئی لاش نے چیخ چیخ کر ان لوگوں کو سنانا چاہا جو اپنے پلنگ سے کسی کی نہ دی ہوئی صدا سن کر اٹھ رہے تھے لیکن کسی نے میری بات نہ سنی۔ سب اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے..... سب اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

وقنا عذاب النار

لاش تیس سال سے بھی زیادہ پرانی تھی مگر اس کی موت کا احساس ہی تیس سال بعد ہوا تو اِسے کیا کیا جائے!

جس نے بھی سنا حیرت زدہ رہ گیا کہ ایک لاش تیس سال تک رکھی رہی اور لوگوں کو یہ احساس تک نہ ہو سکا کہ یہ لاش ہے۔

لیکن سب خموش تھے کہتے بھی کیا کہ غلطی تو اپنی کہ تیس سال تک ایک لاش کو عزت دیتے رہے اور اب اچانک معلوم ہوا کہ جس کی آنی عزت کی گئی وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ تھا۔

لوگ شرمندہ تھے اور مشتعل بھی، لیکن اشتعال کا انفعال بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ جواب تک اُس کی زندگی کا یقین دلا رہے تھے وہ فرار ہو چکے تھے اور لاش تنہا پڑی ہوئی تھی، اور شاید اُس کی تنہائی کا لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا اگر پاس پڑوس والوں کو اُس کے سڑنے کی مہک پریشان نہ کرتی۔ شروع میں تو لوگ سمجھتے رہے کہ شاید ہانڈی پکا ہوا گوشت جل رہا ہے پھر جب مہک بڑھتی گئی تب خیال آیا کہ آس پاس کہیں کوئی چوہا یا بلی یا شاید کتا مر گیا ہو

مگر جب جھک اور بڑھی تو لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے مگر جب ہر طرف سے انکار کی گونج سنائی دی تب بیچ والے اس گھر کی طرف لوگ لپکے جہاں سے کوئی مرد نہیں نکلا تھا۔ مگر وہاں تو تالا لگا تھا، نکلتا کون؟

دروازے تک پہنچتے ہی پہنچتے بدبو کا ایک زوردار بھبھکا لوگوں کی طرف لپکا، لوگ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے، اور تب دوسرا مسئلہ پیدا ہوا کہ دروازے پر لٹکا ہوا تالا کیسے توڑا جائے؟ کیسے اندر جایا جائے؟ مہتروں کی تلاش ہوئی، دو چار مہتر اور ڈوم پکڑ کر لائے گئے، کسی کسی طرح دروازے کا تالا توڑا گیا اور تالا توڑتے توڑتے وہ سب مہتر اور ڈوم بھی بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اب یہ طے ہو چکا تھا کہ سڑنے والی شئے چوہا، کتا یا بلی نہیں بلکہ کافی بڑی وزنی شئے ہے، شاید آدمی، مگر سب سے بڑا سوال تو یہی تھا کہ اندر کیسے جایا جائے؟ دور دراز علاقوں کے لوگ تو آہستہ آہستہ کھسکنے لگے مگر پڑوس والوں کی تو زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور شاید عقدہ لاینحل بھی، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی صورت حال تھی۔ آخر خدا خدا کر کے چند باہمت نوجوان تیار ہوئے، عطر اور کیوڑے میں بسے ہوئے کپڑے ناک پر باندھے گئے اور پھر وہ باہمت اندر داخل ہو گئے اور چند منٹوں میں قے کرتے ہوئے باہر نکلے۔ جب کچھ دیر بعد طبیعت پر سکون ہوئی تو انھوں نے تفصیل بتائی۔

لاش بالکل سڑ چکی تھی، انتڑیاں باہر نکل چکی تھیں، چاروں طرف کیڑے لگے ہوئے تھے اور بدبو سے ساری فضا مکدر ہو رہی تھی، کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے، بعضوں نے پورے گھر کو آگ لگا دینے کا مشورہ دیا مگر محلے کی زندگی کا سوال آڑے آیا کہ آگ لگا

دینا تو بہت آسان ہے مگر بجھانا شاید بہت مشکل' بعضوں نے صرف لاش کی طرف ایک جلتی ہوئی مشعل پھینک دینے کا مشورہ دیا مگر شرع آڑے آئی۔

عجیب بھیانک اور پیچیدہ صورت حال تھی جس سے نپٹنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا، اسی بیچ کچھ ڈاکٹر بھی آگئے اور وہ لوگ خلائی طور پر اندر جانے کے لئے تیار ہو گئے کہ لیبا ریٹری میں تو وہ لوگ طرح طرح کی سڑی گلی لاشیں دیکھتے ہی رہتے ہیں' لہٰذا ڈاکٹر اندر گئے اور واپس آکر بتایا کہ لاش کم از کم تیس سال پرانی ضرور ہے اور یہ بھی اندازہ لگایا کہ یہ برین ہیمبرج کا کیس ہے اور یہ بھی کہ اب کوئی عضو سلامت نہیں ہے اور پھر انہی لوگوں نے مشورہ دیا کہ پوسٹ مارٹم میں معاونت کرنے والے ڈوموں کو بلایا جائے اور ایک کافی لمبی چوڑی قبر کھود کر چوکی سمیت اس کو لے جاکر دفن کر دیا جائے اور نماز جنازہ پہلے یا بعد میں غائبانہ طور پر پڑھ لی جائے۔

مشورہ صحیح اور قابل قبول تھا اور دوسری بات یہ کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہ تھا کہ لاش اس طرح ریزہ ریزہ ہو چکی تھی کہ اب کفن پہنانا بھی ممکن نہیں تھا' اس لئے "الاعمال بالنیات" کے مطابق از روئے فتویٰ و تقویٰ ہر لحاظ سے معذرت کی گنجائش تھی' چنانچہ "غائبانہ نماز جنازہ" کا اعلان ہوا اور اس گھر سے دور محلے کی مسجد کے پاس لوگ جمع ہونے لگے، اور یوں لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے تیس سال پہلے کی اس لاش کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جو موجود ہو کر بھی غائب تھی اور معدوم ہو کر بھی موجود تھی' نماز پڑھ کر لوگ اس گھر کے پاس جمع ہوئے اور ڈوموں کو لاش اندر سے نکال کر قریبی قبرستان میں لے جاکر چوکی سمیت دفن کر دینے کی ہدایت کی اور اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ مگر چند منٹوں بعد ہی ڈوم ہانپتے دوڑتے ہکلاتے پڑوس والوں کے گھر پہنچے اور ہکلا ہکلا کر خوف زدہ انداز میں بتایا کہ وہاں کوئی لاش نہیں ہے۔

یہ دوسری حیرت ناک خبر تھی۔
یہی بات کیا کم حیرت ناک تھی کہ ایک لاش تیس سال تک رکھی رہی اور آس پاس والوں کو اس کا علم نہ ہو سکا، اور اب دوسری حیرت ناک بات یہ کہ لاش غائب ہو گئی، طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں، بعض لوگ ہمت کر کے گھر کے اندر گئے اور ڈوموں کا بیان صحیح ثابت ہوا۔
اور پھر لوگوں کا ایک تانتا بندھ گیا، لاش کے گم ہو جانے کی خبر سن کر تو سارا شہر امنڈ پڑا، شام تک یہ سلسلہ بندھا رہا، آس پاس والے پریشان ہو گئے، سارے شہر میں اس محلے کی اس لاش کی حیرت ناک گمشدگی کی خبر بم کے دھماکے کی طرح پھیلی، پولیس بھی پہنچ گئی محلے والوں کو گواہی بھی دینی پڑی۔ خدا خدا کر کے رات ہوتے ہوتے یہ سب چکر ختم ہوا اور بیچارے بھی تھوڑا بہت لے کر چلتے بنے۔
مگر یہ بات معمہ ہی رہی کہ لاش گئی کہاں؟
جہاں تک لاش کے تیس سال تک نہ بھکنے کا سوال ہے تو اس کا کریڈٹ تو اس گھر کے ان افراد کو دیا جا رہا تھا جو چند دنوں پہلے تک اس گھر میں تھے، اور سچ بھی یہی ہے کہ یہ ان ہی کا جگرا تھا کہ انھوں نے تیس سال تک ایک لاش کو نہ صرف یہ کہ بھکنے سے بچایا بلکہ ہر آنے جانے والے کو یہ یقین دلاتے رہے کہ یہ مردہ نہیں ہے بلکہ کمزور ہو گیا ہے اور اسی لئے آرام کر رہا ہے تاکہ صحت ہو جائے تو دوبارہ زندگی کی دوڑ میں پوری تندہی کے ساتھ حصہ لے مگر لگتا ہے کہ جب ان کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ اب اس لاش کو بھکنے سے نہیں بچایا جا سکتا تو رات کی تاریکی میں چپکے سے فرار ہو گئے۔
مگر پھر بھی یہ سوال تو ہر ذہن میں سانپ کی طرح کلبلا رہا تھا کہ آخر لاش کہاں گئی؟ ہر شخص کے دماغ میں یہی سوال تھا اور ہر آدمی یہی سوال لئے ہوئے سو گیا۔

اور دوسری صبح معلوم ہوا کہ شہر کے بے شمار گھروں کے دروازوں پر لوگ بیہوش پڑے ہیں، ہوش آنے پر سب نے ایک ہی بات بتائی کہ آدھی رات کے وقت کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا اور دروازہ کھولنے پر آدھی لاش ..... آدھی سڑتی ہوئی لاش پر نظر پڑی!

بعض کا بیان تھا کہ وہ سڑی ہوئی لاش سر سے کمر تک تھی اور بعضوں نے صرف کمر سے پیر تک دیکھا۔ پھر دوسری رات بھی یہی ہوا ..... اور تیسری رات بھی یہی ..... اور نتیجتاً ہر گھر کے دروازے پانچ بجے شام سے آٹھ بجے صبح تک بند رہنے لگے کہ لاش رات کی تاریکیوں ہی میں دستک دیتی تھی۔

اور تب دو چار دنوں بعد ایک روز دس بجے دن میں ایک گھر پر دستک ہوئی، صاحب خانہ باہر نکلے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے ..... سڑتی ہوئی آدھی لاش دروازے پر کھڑی تھی ——————

اور پھر شہر کا شہر ویران ہونے لگا۔

لاش اب دن میں بھی گھروں پر دستکیں دینے لگی تھی۔

لوگ دوسرے شہروں کی طرف بھاگنے لگے اس شہر کے اس خدائی قہر سے نجات لے مگر کچھ دنوں بعد نئی مصیبت یہ آن پڑی کہ وہ دو حصوں میں بٹی ہوئی اور سڑی ہوئی لاش یا لاشیں ان شہروں میں بھی پہنچنے لگیں جہاں جہاں لوگ بھاگ کر جا رہے تھے۔

اور اب صورت حال یہ ہے کہ لوگ بھاگ رہے ہیں اور دو حصوں میں بٹی اور سڑی ہوئی لاش یا لاشیں ان کا تعاقب کر رہی ہیں ..... اور اوراد و وظائف، بھجن، کیرتن اور دعاؤں کی محفل گرم ہے۔

لوگ بھاگ رہے ہیں اور اسباب و علل کے بارے میں بے پر کی ہانک رہے ہیں اور آہستہ آہستہ سب دو حصوں میں بٹی ہوئی لاش بنتے جا رہے ہیں ——————

اور انہیں گالیاں دے رہے ہیں جنہوں نے تیس برس تک دھوکے میں رکھا۔

اور اپنا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں جو خود سڑتا جا رہا ہے۔

وقنا عذاب النار ..... وقنا عذاب النار .....

وقنا عذاب النار .....

اندھی دشاؤں کے سائے

میری بیوی ADVANCE STAGE میں تھی اور میں نے احتیاط برتنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی کیونکہ میں سب کچھ برداشت کر سکتا تھا اور اپنے بچے پر آنے والی ہر مصیبت اور دکھ سے بے فکر ہو سکتا تھا لیکن یہ بات میری برداشت سے باہر تھی۔ کہ وہی میرے بچے کو بھی پریشان کیے جو کل میرے پرکھوں کو پریشان کر چکا ہے اور آج میری زندگی دوبھر کر رہا ہے مجھے اگر کم از کم اس کا بھی اطمینان ہوتا کہ کچھ دور جانے کے بعد اس سے ملاقات ہو گی تو میں مطمئن رہتا کہ یوں بھی سفر میں کچھ رستہ طے کرنے کے بعد خوشبوئیں اور بدبوئیں دونوں اپنا لمس چھوڑ جاتی ہیں اور انسان ان دونوں کے درمیان فرق کرنا جان جاتا ہے اور کسی ایک کو کنارے پھینک دینے کی طاقت بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن میں وہ صبح کیسے بھول جاؤں جب میں ہزاروں میل گہرے سیاہ غاروں سے منوں اندھی میٹیوں کی پرتیں ہٹا کر اوپر آیا تو سب سے پہلا احساس جس نے آگے بڑھ کر میرا دامن تھاما، وہ اس کی آمد کا تھا۔

آپ اسے اعلان کہیئے، احساس کہیئے یا سرگوشی، لیکن بہرحال کچھ تھا ضرور جو خلاؤں

کی چادر پھاڑ کر اور سنسناتی ہواؤں کے سینے چیر کر آتی جاتی سانس کی طرح بس ایک خوف زدہ کیفیت بن چکا تھا جس کو محسوس کیا جا سکتا ہے، لیکن بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یوں مشہور تو یہ بھی ہے کہ صرف میں ہی نہیں، بلکہ میرے پرکھوں نے بھی اپنی بیویوں سے صحبت کے وقت اور ماؤں نے اپنے بچوں کو گھونٹی دیتے وقت سانسوں کے زیر و بم، پلکوں کی جنبش اور انگلیوں کے سہارے یہ بتا دیا تھا کہ وہ آنے والا ہے ..... وہ کسی وقت بھی آسکتا ہے۔

میں پرکھوں کی بات نہیں کر رہا ہوں کہ بہر حال وہ مر چکے لیکن خود مجھے اس نے بہت پریشان کیا، ذہنوں میں دائمت کا ڈر کر دراڑیں پیدا کرنے کی بات جہاں سے شروع ہوتی ہے، اسی نقطے سے اس کا سفر بھی شروع ہوتا ہے۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ وہ ہر جگہ، ہر موڑ اور ہر پل ہمارے ساتھ رہا اور زندگی کے تمام بڑے چھوٹے طلسموں پر حاوی ہے، لیکن مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ مرکزی حیثیت در اصل اسی کی ہے باقی سب کچھ تو اسی ایک دائرے کے گرد گردش کرنے والے نقطے ہیں، اور میں اسی نقطے اور دائرے کے چکر سے بچنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ دھڑکا تو ہر وقت لگا رہتا ہے کہ "وہ آنے والا ہے ..... وہ کسی وقت بھی آسکتا ہے"۔

... وادی میں الاؤ روشن تھے، جشن منایا جا رہا تھا، لوگ الگ الگ ٹولیوں میں زندگی کی لذتوں کو چکھ رہے تھے۔ کسی طرف آج کئے گئے شکار کا حال بیان کیا جا رہا تھا اور کہیں ان خطروں کو اشاروں کے سہارے سمجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی جو کسی وقت بھی درپیش ہو سکتا تھا کہ اچانک سب کی آنکھوں میں کالے پیلے سائے لہرانے لگے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں سب نے ایک دوسرے سے کچھ کہا، خموش لب ..... اور گویا آنکھیں .....

اور پھر یوں ہوا کہ لوگوں کے قدم تھم گئے، چہرے پیلے پڑ گئے، روشنیاں ماند پڑ گئیں اور سب اپنے اپنے پڑاؤ کی طرف دبے قدموں چل دیے اور آپ سے اعلان

کچھے یا احساس یا سرگوشی، لیکن بہرحال کچھ تھا ضرور جو خلاؤں کی چادر پھاڑ کر اور سنسناتی ہواؤں کے سینے چیر کر آتی جاتی سانس کی طرح بس ایک خوف زدہ کیفیت بن چکا تھا ... کیفیت جو احساس بن جاتی ہے، کہ "وہ آنے والا ہے ۔۔۔ وہ کسی وقت بھی آسکتا ہے":

یہ واقعہ بہت پرانا ہے، لیکن سانسوں کی آمد و شد کا ایک حصّہ ہے کیونکہ ہم کس لمحے کو کس لمحے سے الگ کریں یہ فیصلہ بہت دشوار ہے اور پھر ...... میں تو آج بھی آدمیوں کے درمیان آگے، پیچھے، دائیں، یا بائیں سرکتے ہوئے، تھرکتے قدموں اور چمکتی آنکھوں کے کونوں میں جھانکتے ہوئے اس اعلان یا احساس یا سرگوشی کو پڑھ لیتا ہوں کہ وہ آنے والا ہے... وہ کسی وقت بھی آسکتا ہے"

پہلے تو میں سمجھتا تھا کہ اوّل تو یہ کہ وہ ہے ہی نہیں، اور اگر ہے تو کائر ہے، کمینہ ہے، ڈھونگی ہے، نظر باندھنے والا ہے، جو جب جی چاہے، جیسے جی چاہے، بس لوگوں کو خوف زدہ کرتا رہتا ہے، اس میں خود کھل کر سامنے آنے کی طاقت نہیں اسی لئے ڈھونگ رچاتا ہے، ہر دشا پر چھا کر سب کی نظر باندھ دیتا ہے، خود سب کو دیکھتا ہے، جو جی چاہتا ہے کرتا ہے اور ہم بس دیکھتے رہ جاتے ہیں.... سوچتے رہ جاتے ہیں کہ کیا کریں ..... کیا نہ کریں!

لیکن گزشتہ دنوں کے واقعات نے اس کے نہ ہونے کی بات کو دھندلکوں کا مسافر بنا دیا ہے، اور کم از کم ایک واقعے کو فراموش کرنا تو میرے لئے ناممکن ہے، کہ اس نے اس وقت اپنی سانسوں کو میری پلکوں میں انڈیل دیا جب میں اپنی بیوی میں اتر رہا تھا، اترنے کے اس نئے عمل سے پہلے کئی ساقط حمل ہم دونوں کو اداس دل اور بھیگی پلکوں کی امانت سونپ چکا تھا اور اس لئے صرف اسی مرتبہ نہیں، بلکہ پچھلی کئی دفعہ بھی ہم دونوں نے بڑی احتیاط برتی، مگر کوئی تھا جو کوکھ میں گھس کر سب کچھ ختم کر دیتا اور اب کے بھی یہی ڈر ہم دونوں پہ حاوی تھا اور اسی لئے ہم دونوں چاہتے تھے کہ جڑیں اتنی گہری ہوں، کہ کوئی طوفان ہلا نہ سکے، ہم نے بیج بونے کے وقت بھی تمام بہتر طریقے استعمال کئے، لیکن لمحہ... بس وہ ایک لمحہ جو صدیوں پہ حاوی ہوتا ہے، نہ جانے کیسے بکھر گیا اور ہم دونوں

ہی اس آہٹ پہ چونک گئے۔ جو نہ جانے کس کی آمد کا اعلان تھی... ہم ایک دوسرے سے چپک گئے... ساکت لب، ساکت پلکیں... اور ساکت جسم... باہر گھٹا ٹوپ اندھیارا... ہوا کی سنسناہٹ... اور ان سب کے درمیان ایک چاپ.... ایک سرگوشی... ایک احساس۔

"کوئی آرہا ہے" میری بیوی بید کی مانند کانپ رہی تھی۔

میں نے اپنی پوری طاقت جمع کی اور چیخ کر کہنا چاہا "ڈھونگی سامنا کیوں نہیں کرتا؟ صرف چاپ کے سہارے عورتوں کو ڈرانا جانتا ہے؟" لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری آواز کو خود بھی پالا مار گیا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ خود ہی وہ چاپ بھی کسی سمت کھو گئی اور ادھر خلاف توقع نہ جانے کیسے پانی بھی قطرہ قطرہ کر کے جرمنک پہنچ چکا تھا۔

"پھر وہی ہو گا؟" میری بیوی کی خوف زدہ آنکھوں میں سوال دانت نکوسے کھڑا تھا۔

"پاگل!" میں نے بیوی کو اطمینان دلانے کے لئے اس کے گال تھپتھپائے اور چارپائی سے اٹھ گیا، لیکن خود میری رگ رگ میں آتی جاتی لہریں بھی اُن ہی لمحوں سے ڈر رہی تھیں جو سب کچھ ہوا میں بکھیر دیتے ہیں۔

"نہیں، نہیں... ایسا نہیں ہو گا" میں نے اپنے آپ کو اطمینان دلایا، لیکن بس ایک احساس... ایک اعلان... ایک سرگوشی..... "وہ آرہا ہے ..... وہ کسی وقت بھی آسکتا ہے۔"

تو پھر یوں ہوا کہ لمحے لمحوں پر دھڑا دھڑ گر گر کر ٹوٹنے لگے اور اب میری بیوی ADVANCE STAGE میں تھی۔

یہ بھی صحیح ہے کہ میری بیوی کے یہاں واضح طور پر اس کی آمد کا کوئی تصور نہیں تھا، لیکن پھر بھی وہ ہر ایک کی آمد سے نہ جانے کیوں ڈر جاتی تھی... چونک چونک پڑتی تھی، اور میں جانتا تھا کہ یہ وہی شے ہے جو میرے سامنے دھند بن کر مجسم کھڑی ہے اور

میری بیوی کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑتی رہتی ہے اور میں اس بات سے ڈرتا بھی تھا، کہ جو شے سامنے ہے اُسے تو رد کیا جا سکتا ہے مگر جب خون اور سانس بن جائے تو اس کا کیا علاج ہو گا؟ اور اگر کہیں یہی سانس میرے بچّے کا بھی مقدّر بن گئی تو... تو...؟

میں نے کئی بار اسے اس سے آگاہ کرنے کا ارادہ بھی کیا، لیکن عین اسی لمحہ وہ ایک احساس مجھ پہ حاوی ہو جاتا ہے۔

"کوئی ہے..... کوئی سن رہا ہے..... کوئی دیکھ رہا ہے ..... کوئی آ رہا ہے... آ رہا ہے....."

اور میری زبان ہمیشہ لفظوں کو ترستی ہی رہی اور میری بیوی اپنی سانسوں سے لت پت اُس بوجھ کو اُٹھائے گھومتی رہی جو میری بخشش تھی۔

"اے کاش..... اے کاش!"

"دیکھئے نا..... اِدھر اُدھر چاروں طرف کیا دیکھ رہا ہے" میری بیوی بچّے کو پیار سے چومتے ہوئے میری جانب نظریں جھکا کر اور مسکرا کر بولی۔

"تو گویا سانسیں اس کا بھی مقدّر بن گئیں" میں نے سر جھکا لیا، آج سارا آئینہ لُٹ چکا تھا اور وہ ہو چکا تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔

"کاش! تو اِس پر بھی چھا گیا؟ یہ بھی تیرے ڈر سے چاروں طرف دیکھ رہا ہے کہ کہیں تو، آئینہ جلائے..... کہیں تو، آئینہ گیا ہو"

"نہیں میرے بچّے..... نہیں! میں تیری حفاظت کروں گا" میں اُسکی جانب جھکا اور اس کا بوسہ لینا چاہا لیکن ایک دم چونک کر جلدی سے کنارے ہٹ گیا۔

"میں وہ تو نہیں بیٹے، جو تم چیخ چیخ کر رونے لگے" میں نے کہنا چاہا لیکن میری بیوی نے بچّے کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا اور اب وہ سسک سسک کر رو رہا تھا اور چُسر چُسر پی رہا تھا۔

"آپ سے ڈر گیا" بیوی نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں! — AUDI PUS COMPLEX ہے" میرے بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہنسی، مسکراہٹ اور سسکیوں کے اس امتزاج سے میں نے کوئی ایسا ملحہ تلاش کرنا چاہا جو میرا ہو، لیکن میری مٹھیاں چمڑے کے سوا اور کچھ نہ پا سکیں۔

اور اب یہ آخری لمحہ ہے جو میرے سامنے ہے، میں جس کا قیدی ہوں۔

میں اور میری بیوی دالان میں بچے کو کھلا رہی تھی، کہ اب میں بچے کو پیار بھی کرتا ہوں، اُسے گود میں بھی لے لیتا ہوں، وہ اب مجھ سے ڈرتا بھی نہیں ہے، لیکن اس کی آنکھیں..... میں ان آنکھوں سے بہت ہراساں ہوں کہ یہ ہر وقت نہ جانے کیا کھوجتی رہتی ہیں، کبھی اِن آنکھوں میں کالے پیلے سائے لہراتے ہیں، کبھی سُرخ ڈوروں کی فیج نظر آتی ہے، اور کبھی یہی آنکھیں موسیٰ کی آنکھیں بن جاتی ہیں..... میں نے بارہا اِن آنکھوں کو کسی ایک مرکز پر لانا چاہا، لیکن پنچھی کبھی قید ہوئے ہیں؟

میری دالان کے اوپر چھپر تھی اور جہاں پر میرے بچے کی چارپائی تھی اس کے بائیں جانب اُوپر میں ایک گول تھی، میرا بچہ کھیلتے کھیلتے بار بار اس گول کی جانب تاکتا جیسے سمندر کا سارا جھاگ اسی کا ورثہ ہو، میں نے اپنے بچے کی نظروں کا تعاقب کیا، تو معلوم ہوا کہ گول کے ایک سوراخ پر اس کی آنکھیں جمی ہوئی ہیں جس میں بچھو اور کنگوجرسی مشابہت کا کوئی جانور بار بار جاتا ہے اور پھر باہر آتا ہے... جاتا ہے اور پھر باہر آتا ہے..... جاتا ہے اور پھر باہر آتا ہے۔

ابتدا کے چند پل شہادت اور بیچ والی انگلی کے فاصلے پر محیط تھے، پھر فاصلہ بڑھتا گیا..... لمحوں کا بھی اور انگلیوں کا بھی۔

فاصلہ! انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کا

فاصلہ! انگوٹھے اور بیچ والی انگلی کا

فاصلہ! انگوٹھے اور بیچ والی انگلی کے بغل والی انگلی کا

فاصلہ! انگوٹھے اور چھنگلیا کا

اور اب دائرہ ٹوٹ چکا تھا...... فاصلہ طویل ہو چکا تھا، لمحہ فاصلے کی قید توڑ کر دائرے سے باہر آ چکا تھا۔

اور میرے بچّے کی آنکھیں... اور گول... اور سُوراخ... اور بچھّو والا کنگوجہ جیسا جانور......

"اور میرے بچّے کی آنکھیں......"

"بیٹا..... اِدھر دیکھو..... بیٹا!" میں نے اُسے چٹکیوں کے سہارے اپنی جانب متوجّہ کرنا چاہا۔

لیکن میرے بچّے کی آنکھیں..... اور بچھّو اور کنگوجہ جیسا جانور...... اور اُن آنکھوں کا رنگ..... اور کالے پیلے سائے..... اور ایک احساس..... ایک اعلان..... ایک سرگوشی..... "وہ آ رہا ہے..... وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔"

اب کے یہ احساس میری سرخ رگوں کو بھی زندہ نہ کر سکا، بلکہ پورے وجود پر پیلے رنگ چھا گئے۔

"بیٹا..... شش..... بیٹا!" آواز کو پھر پالا مار گیا۔

اور اب کے جو میری نظریں اٹھیں تو ایک عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ بچھّو اور کنگوجہ جیسا وہ جانور سارے دائروں کی ٹوٹن سے بے پروا ایک جگہ ساکت کھڑا تھا۔

"ایسا کیوں؟..... ایسا کیوں؟" میرے وجود کے اوپری حصّے میں سیاہ بادل اُمڈ گھمڈ کر برسنے کی تیاری کر رہے تھے۔

اور میرے بچّے کی آنکھیں..... اور ان آنکھوں کا رنگ..... جیسے انتظار کے سارے جہا ساگر اُن میں اُمڈ پڑے ہوں۔

اور پھر ایک نیا منظر: بچھّو خطِ مستقیم (———) کی شکل میں تبدیل ہو گیا اور کنگوجہ زاویہ قائمہ (⊥) بنا کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

میں نے اپنا سینہ پکڑ رکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سانس اور جسم کا رشتہ منقطع ہو کر ہی رہے گا..... یہ کیا ہو رہا ہے..... یہ کیا ہو رہا ہے؟

اور پھر چند لمحوں بعد بچھو اور کنگوجر دونوں، صلیب (   ) کی صورت ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ اور اچانک ہوا کا زور بڑھ گیا، طوفانوں کی آمد آمد تھی، بادل امڈ گھمنڈ کر برسنے والے تھے، اور میرے بچے کی آنکھیں اور آنکھوں کا رنگ، اور میں، اور میری بیوی، جو آنے والے تمام طوفانوں سے بے خبر بچے کی جھبلیا سی رہی تھی' اور ہوا کی سنسناہٹ، اور طوفان، اور باد و باراں' اور ان سب کے درمیان، ایک اعلان، ایک احساس، ایک سرگوشی..... "وہ آرہا ہے..... وہ آرہا ہے"

اور اب وہ گول سے الگ ہوگیا، کچھ دیر تک آسمان و زمین کے درمیان معلق رہا..... اور اب وہ زمین پر آکر ٹک گیا ہے.....

"اے..... اے" میں نے آہستہ سے اپنی بیوی کا شانہ دبایا... میں نے اشارے سے اس کو اس طرف متوجہ کیا۔

"ہائے، ٹھیک یاد دلایا آپ نے!" وہ وہیں ہیٹر پر رکھے ہوئے دودھ کو اُبلتا دیکھ کر ہیٹر کی طرف لپکی..... "سنیئے..... ذرا دروازے کی طرف دیکھتے رہیئے، کوئی آنہ جائے....."

میری بیوی نے ہیٹر پر سے دودھ اُتارتے ہوئے کہا، اور میں اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا..... "وہ آرہا ہے..... وہ آگیا ہے....."

اور اب وہ بڑھ رہا ہے..... اُس کا حلیہ بھی عجیب ہے، آنکھیں ماتھے پر، ہونٹ غائب، ناک غائب..... صرف آنکھیں..... بس آنکھیں..... اور میرے بچے کی آنکھیں..... اور ان آنکھوں کا رنگ.....

اور اب وہ میرے بچے کے سرہانے آگیا ہے..... میں پسینے میں شرابور ہو رہا ہوں.....

وہ میری طرف تمسخرانہ انداز میں دیکھتا ہے، پھر بچے کے ماتھے پر جھکنے لگتا ہے..... وہ جھک رہا ہے..... وہ جھک رہا ہے..... میں دیکھ رہا ہوں.....

اور اچانک نہ جانے کہاں سے میرے اندر طاقت عود کر آئی، اور میں نے اسے گھونسے گھونسے مارنا شروع کر دیا، لیکن وہ میرے گھونسوں سے لاپروا میرے بچے کے ماتھے کی طرف جھکتا جا رہا ہے۔

میں گھبراہٹ میں اُسے گھونسوں اور لاتوں سے مار رہا ہوں لیکن پھر بھی وہ جھکتا جا رہا ہے۔

میں مار رہا ہوں، وہ جھک رہا ہے!
میں مار رہا ہوں، وہ جھک رہا ہے!!
میں مار رہا ہوں، وہ جھک رہا ہے!!

امرلتا

جون کی جلتی تپتی اور سلگتی ہوئی دوپہر میں قطرہ قطرہ شبنم ٹپک رہی ہے۔
اور میں جو انجانے میں کلیوں کے اس وسیع و عریض صحرا کا راہی بن گیا ہوں
حیران و پریشان اس لق و دق سنسان بیابان میں یک و تنہا کھڑا سوچ رہا ہوں کہ لمحہ
جو ٹھہرا ہوا ہے اور شبنم جو لرز لرز کر پھوار کے انداز میں اس ریگستان کو اپنے لمس کے مدھم
وجود سے آشنا کر رہی ہے۔ ان دونوں میں سے کس کو میں اپنے آپ سے پرے کر سکتا ہوں
اس لئے کہ آئینے میرے اپنے میں پیوست ہوتی جا رہی ہیں، اور میں دونوں ہاتھ آسمان کی طرف
اٹھائے دیدۂ حیراں وا کئے اس بات کا منتظر ہوں کہ کب جنت اور جہنم کو کوئی رابعہ بھری
آگ سے جلا کر اور پانی سے بجھا کر میرے ہاتھوں پہ لا کر رکھ دے اور میں اسے لے جا کر دنیا والوں
کے منہ پر مار آؤں اور پوچھوں ــــــ

"اب بھی اپنا خون فضاؤں میں اچھالو گے؟"

لیکن میں یہ سب کچھ شاید نہ کر سکوں۔ اس لئے کہ آیتیں میرے سینے میں پیوست

ہوتی جارہی ہیں اور ہر نقطہ آنکھوں میں گھستا چلا آرہا ہے۔

لے لمحو! دم لو... ذرا دیر کو ٹھہر جاؤ۔ دلوں کی رہ گذر ابھی اتنی پتھریلی نہیں ہوئی ہے کہ خون کے چند قطرے بھی نہ بخش سکے... چہرے پہ خون تو مل لینے دو... پیچھے مڑ کر دیکھ لینے دو۔ اس سمندر کے کنارے جہاں ایک جانب اتھاہ گدلے پانیوں کے ستون سطح مرتفع پہ پڑے ہوئے ہیں اور دوسری جانب تپتا، جلتا اور سلگتا ہوا وہ علاقہ ہے جو دن میں ریگستان ہو جاتا ہے اور رات میں ساحل، اور میں ان دونوں کے بیچ کھڑا ہوا ناریل اور کھجور کے درختوں کے پرے... اور پرے... اور پرے... اتنا پرے چلا جانا چاہتا ہوں کہ میں خود ایک نقطہ موہوم میں تبدیل ہو جاؤں، میرے قدموں کے نقوش غبار کی دھندلاہٹوں میں گم ہو جائیں اور میں اس دیار سے آتی ہوئی خوشبوؤں کی ہر لہر اپنے سینے میں جذب کر لوں جہاں سب کچھ سہن کرنے والوں کے چہرے پہ سولج کا غازہ ملا جاتا ہے اور پل پل میں ٹوٹنے والوں کے ماتھے پہ چاند کا جھومر ——

تو میں (جیسے کلیولس کے وسیع و عریض صحرا میں سفر کرتے ہوئے زمانہ بیت گیا) نہ جانے کب سے دریا اور صحرا کے بیچوں بیچ اس امید میں کھڑا ہوں کہ کوئی کشتی، کوئی طوفان، میرے شانوں پہ اپنے ہاتھ رکھے، میرے ہاتھ کو اپنی مٹھی میں دبائے اور کہے "چلو، میں آگیا ہوں"

اور میں چلنے سے پہلے ایک بار... صرف ایک بار... پیچھے مڑ کر دیکھوں، ... کھجوروں اور ناریل کے درختوں سے بھی آگے، وہاں، جہاں کہرا چھایا ہوا ہوگا اور وقت ہو ہوا ... ہو کر ہر طرف بکھرا پڑا ہوگا، کہ جہاں سے جی چاہے اٹھا لو... دبوچ لو...!

لیکن ایسا ہوتا کہاں ہے، جو چاہو وہ کبھی نہیں ہوتا... کبھی نہیں ملتا۔

میں نے بھی یہ سب کچھ چاہا تھا (اور چاہتا ہوں) لیکن سب کا مقدر ایک سا تو نہیں ہوتا۔ کسی کو دل دریا ملتا ہے اور کسی کو دل کا صحرا... کسی کے سینے میں آیتیں پیوست ہوتی ہیں اور کوئی خود آیت بن جاتا ہے۔ میں شروع سے اپنی

ذات میں منتشر ہو رہا ہوں۔ سنتا ہوں کہ میری پیدائش کے دن آٹھوں بیٹے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے، ساری کسر تو اسی دن نکل گئی۔ اب کوئی کیوں میرا ساتھ دے، اب تو اکیلے پن کا یہ عالم ہے کہ خود ہی روتا ہوں، خود ہی قہقہے لگاتا ہوں اور خود ہی اپنے لب چھو کر یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہنس رہا ہوں، مسکرا رہا ہوں۔

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ ان لوگوں سے پوچھوں (جو سیلاب آنے پر خود تو ہیلی کوپٹر کے ذریعے سیلاب زدہ علاقوں کے پار چلے گئے اور اپنی خاص الخاص ذریت کے لئے کشتی اور بوٹ کا انتظام کر دیا) کہ "حضرت! آپ نے ان لوگوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچا جن کے پاس کچھ بھی نہ تھا" لیکن پھر یہ سب سوچ کر خاموش رہ جاتا ہوں کہ کہیں وہ یہ جواب نہ دے دیں، کہ "تم نے دیکھا نہیں؟ ان میں سے بہت سارے لوگوں نے پل کا کام کیا اور ہمارے آدمی ان کے پیٹھوں پر چلتے ہوئے اس پار چلے گئے۔"

سوچتا ہوں، کہانی کہاں سے شروع کروں؟

"تو تم نے محسوس کیا نا؟ دراصل یہ مسئلہ نہ تو سوشیولوجی سے تعلق رکھتا ہے نہ سائیکلوجی سے اور نہ ہی پولیٹکس سے، بلکہ اس کا تعلق صرف اور صرف ہمارے بائیں طرف والے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی کچھ تصویروں سے متعلق ہے۔ کچھ ان STATUES اور نقوش (برد یوار) سے متعلق ہے جنھیں نہ مٹایا جا سکتا ہے اور نہ مٹایا جا سکتا ہے اور تم یقین مانو پانچ سال کسی ایک مکان میں رہنے کے بعد مالک مکان کو قانونی طور پر اس کی اجازت حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کو اس کی مرضی کے بغیر اس مکان سے نہ نکال سکے اور پھر یہ کیسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کمرہ میرا ہے، یہ آنگن تیرا ہے، وہ دالان اس کی ہے ...

یہ سارا فراڈ تو دراصل ان لوگوں کا پھیلایا ہوا ہے، جو فٹ پاتھ پہ سوتے ہیں، کہ ان کا کچھ بھی نہیں۔"

"جب کسی مکان کا مفروضہ مالک یہ محسوس کرتا ہے کہ اس مکان میں کچھ ایسے لوگ بھی آ گئے ہیں جو اس کی پسند کے نہیں تو وہ انھیں کسی طرح بھی اپنے گھر سے باہر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ قانون وغیرہ کی بات تو اب کتابوں ہی میں بہتر معلوم ہوتی ہے،

عملی زندگی سے یہ الفاظ میل نہیں کھاتے۔" اور میرے اسی اندازِ فکر کو میرے چھوٹے بڑے بھائیوں نے پسند کیا اور چاہا کہ سیلاب آنے کے پہلے اُس پار پہنچ کر کوئی اچھا سا مکان لے لیا جائے، ورنہ اگر سیلاب آگیا تو پھر پار پہنچنا بہت مشکل ہو جائے گا لیکن بابا زندگی کی ان قدروں کے قائل تھے جس میں دوسروں پر اندھا یقین کرنا بھی شامل ہے۔

"چھوٹی رانی چھوٹی رانی... تم ہو بڑی سیانی۔" رام کشن انکل کی چھوٹی لڑکی سُشما کو جب بھی میں کہتا تو وہ زوردار طریقے پر غصہ ہو جاتی۔

لے لمحو! ذرا دیر کو ٹھہر جاؤ۔ دلوں کی رہ گزر لہولہان ہو رہی ہے۔

٥ "جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر۔"

"جی، میں خود اذیت پسند نہیں۔ آپ اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھیے۔" میں اپنے سامنے والے کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

میں نے اپنی جوانی کی نیم روشن دوپہر میں جو خواب دیکھے تھے میں ان کی تعبیر جاننے کے لئے بے چین تھا۔ کلیوں کی خوشبو پھیلتی جا رہی تھی، شہد کی مکھیوں کا نغمہ فضا میں گونج رہا تھا اور وہ ایک جانب جنّت اور دوسری جانب دوزخ لئے قریہ قریہ، نگر نگر اور بستی بستی چیختا پھر رہا تھا "کوئی ہے جو جنّت خریدے!... کوئی ہے جو جنّت خریدے!" اور لوگ "رابعہ آگئیں، رابعہ آگئیں" چلاتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور جب بابا نے انھیں سمجھانا چاہا اور بتایا کہ "یہ دجّال ہے رابعہ نہیں" تو دوسروں کا ذکر تو چھوڑیئے خود میں نے اور میرے چھوٹے بڑے بھائیوں نے بابا کے منہ کو ہری سوئی اور ہرے تاگے سے سی دیا کہ یہ ہمارے خیال میں ثواب کا کام تھا ــــــ

"کم از کم اب بابا کفر تو نہ بک سکیں گے۔" ہم سب نے یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا اور جانے والوں کے پیچھے دوڑے کہ ہم وقت کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ لینا چاہتے تھے، اور پھر اچانک کچھ یوں ہوا کہ صورِ اسرافیل گونج اٹھی، زمین ہلنے لگی، پہاڑ روئی کے گالے کی طرح فضا میں بکھر گئے، آسمان سے خون کی بارش ہونے

ئی اور فضا میں دوزخی بدبو سے مہک اُٹھیں اور تب اس وقت اچانک ہم نے دیکھا کہ جنّت اور جہنّم کا مالک جسے ہم نے رابعہ بصری سمجھا تھا، اپنے گدھے پہ سوار ہوا اور پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے شور مچایا" دجّال... دجّال" اور کچھ چیخ اُٹھے" رابعہ اپنی قالین پہ ہوا میں اُڑ رہی ہیں۔"

ایک انبوہ اس کے پیچھے دوڑا، کچھ پسے، کچھ مرے، کچھ زخمی ہوئے اور کچھ اس کے ساتھ دریاؤں کو پار کرتے ہوئے، بیچ دریا میں ڈوب گئے اور جو بچ سکے تھے وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔

میں رکا، دوڑا، ٹھٹکا، چلا، بیٹھا اور جب قدرے سکون ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس اپنا کچھ بھی کچھ بھی نہیں ہے، سب کچھ لٹ چکا ہے... بکھر چکا ہے!

آگرے کے مقبرے میں ایک دیوانہ چیخ رہا تھا" اے لوگو! تمھیں گنگا کی موجیں آواز دیتی ہیں، جمنا کی لہریں بلا رہی ہیں... تم نے ان رہ گذاروں کو اپنے خون سے روشن کیا ہے... اسے چھوڑ کر مت جاؤ... اے لوگو!"

لیکن دیوانہ دیوانہ تھا، عقل و خرد والے کی بات کیوں سنتے۔ سب دریاؤں اور پہاڑوں کو پار کر چکے تھے اور سرسبز میدانوں میں پھیلتے جا رہے تھے ——

پھر جب آرین دوآبہ گنگا میں اُترے تو انھوں نے غیر آرین کو دھکّے دے کر باہر نکال دیا ——

داستان بیچ سے کچھ غیر متعلق ہو گئی ہے لیکن ذرا دم لیجیے، کہ داستان گو خود ٹھٹک گیا تھا، تھک گیا تھا، اس نے کچھ دیر رک کر آرام کیا اور پھر دوڑتا ہوا اپنے بابا کے گھر کی طرف بھاگا، اس کا منہ کھول دے اور اُسے یہ خوش خبری سنائے کہ "میں نے اسی مکان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے بابا۔"

"لو یہ مہاشے پھر آ گئے" مکان میں داخل ہوتے ہوئے اس نے چہرے پہ ایسا تاثر طاری کر لیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو، اور مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

"ہنوز چشمش نگرانست ۔ کہ ملکش بادگر آنست"

میں چند لمحوں تک دیوار کا سہارا لیے کھڑا رہا اور پھر جب میں نے اپنے آپ میں کچھ RELIEF محسوس کیا تو تیر کی سی تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا گھر سے نکلا اور راستے کی ساری سختیوں کو برداشت کرتا ہوا سبز میدانوں میں پہنچ گیا، اور اب میں کلیوں کے اس وسیع و عریض صحرا کا راہی بن چکا ہوں جہاں قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے خون سے نہ تو چراغاں ہو پا رہا ہے اور نہ اندھیرا۔ ہر طرف ایک عجیب سا دھندلکا چھایا ہوا ہے اور میں خوشبوؤں کا تابوت اپنے سینے سے لگائے ان آیتوں کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو میرے سینے میں پیوست ہوتی جا رہی ہیں ——

میں نے زندگی کے ہر دکھ کو تمھارے نام معنون کر دیا اور خوشیوں کے ہر نقطے کو اس سبز میدان کا پھول قرار دیا۔ یہ میں نے اس لئے کیا کہ تمھارے بارے میں اپنے ذہن میں بدگمانیوں کو جگہ دے سکوں اور اس طرح تمھیں بھلا سکوں، لیکن اسے کیا کروں کہ میرے خواب ہوں یا میری بیداری، تم ہر جگہ میرے ساتھ رہتے ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہاں کے پہاڑ تمھارے پہاڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں (یوں یہ پہاڑ بھی تمھارے ہی ہیں) اور یہاں کے شہر بھی تمھارے شہر بن جاتے ہیں۔ چلتے چلتے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے یہ بازار، یہ گلیاں، یہ سڑکیں، یہ عورت، یہ مرد، یہ لوگ، کوئی شے یہاں کی نہیں ہے سب تمھاری ہیں، بس ہر طرف تم ہی نظر آتے ہو... تمھارے جلوے... تمھاری نشانیاں ... تمھارے اثرات!

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر منظر اجنبی بن جاتا ہے، کوئی شے اپنی نہیں معلوم ہوتی۔ ہر چہرہ پرایا ہو جاتا ہے اور ہر آواز ان سنی۔ رستے صحرا بن جاتے ہیں جہاں چلتے ہوئے قدموں کی خاکیت حنائیت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور دور دور تک دریا تو درکنار کسی سراب کا بھی نام و نشان نہیں ملتا، تم نے اپنے آپ سے مجھے کیوں جدا کر دیا؟ میں تم سے پوچھ رہا ہوں... مجھے جواب دو، خموش نہ رہو۔ میں بہت دکھی ہوں دوست! یہاں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں دھندلی دھندلی نیم روشن فضا میں زمین و آسمان کے بیچ کھڑا ہوں جہاں کوئی تصویر واضح نہیں، کوئی آواز صاف نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

سامنے کوئی ہے لیکن چھونے کی کوشش کرتے ہیں، بس واااور دور چلا جاتا ہے، کوئی آواز کانوں میں آرہی ہے لیکن سننا چاہتا ہوں تو سن نہیں پاتا ــــــ

یہاں ہر آواز اجنبی اور ہر سہارا شکستہ ہے ماں! میرے دونوں ہاتھ بھی اب مجھ سے برگشتہ ہو چکے ہیں، یہ وہی ہیں ماں، جو صدیوں سے میرے ساتھ چل رہے تھے لیکن آج وہ آپس میں اشاروں میں اور نہ سمجھی جانے والی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، اور مجھے متوجہ پاکر چپ ہو جاتے ہیں۔ جب گھر سے باہر نکلتا ہوں تو ہر نظر مجھ پہ ایستادہ ہو جاتی ہے جیسے میں بھکاری ہوں جیسے پہاڑوں، دریاؤں اور سبز میدانوں کی فتحیابی کے سلسلے میں میرا کوئی کریڈٹ ہی نہ ہو۔ تم ہی سوچو بابا! اس فتحیابی کا سہرا کیا صرف میرے دونوں ہاتھوں کے سر ہے؟ اگر میں نہ ہوتا تو یہ آخر کیا کر سکتے تھے؟ لیکن آج یہ میرے دشمن ہو چکے ہیں جیسے ان سے میرا کبھی کا واسطہ ہی نہ ہو۔

اور جانتے ہو بھیا، کبھی کبھی تو یہ مجھ پہ الزام رکھتے ہیں کہ "تمھارے آجانے کی وجہ سے ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تم واپس اپنے خول میں جاؤ"!

جانِ تمنّا! تم نے مجھے یہ کس جگہ پھینک دیا ہے، اب دوری برداشت نہیں ہوگی، لیکن نہیں، تم پہ کیوں الزام رکھوں؟ کیوں کہ اس وسیع و عریض صحرا کا راہی خود ہی تو بنا ہوں، پھر بھی یہ تمنّا ضرور ہے آپی کہ کوئی ایسی گہری سیاہ رات آئے جب میں ساحل پہ کھڑا رہوں اور دور فاصلے پہ ایک چراغ تیرتا ہوا نظر آئے جو لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتا جائے... قریب... قریب... اور قریب... اور قریب... اور پھر کوئی کشتی، کوئی طوفان میرے شانوں پہ اپنے ہاتھ رکھے... میرے ہاتھوں کو اپنی مٹھی میں دبائے اور کہے ــــــ

"چلو میں آگیا ہوں!!"

الیٰ حین[ع۱]

(نذرِ ہمسائگان)

نجات ممکن ہے بشرطیکہ مقامِ متعیّنہ سے زوال آمادگی عندیہ دینے۔

پیغامبر مایوس لوٹا، کہ شام سر پہ کھڑی تھی اور پرندے کے جسم کا سارا لہو اس کے بازوؤں میں سمٹ آیا تھا۔

دوست اور ممتا صفت مٹّی سخت تھی اور نرم ہوائیں لُو کے تھپیڑوں کی ہم رنگ۔

حصار پر دھند حاوی، باہر دیو زاد اجداد کے دیو زاد جانشیں جبلّت کے ہر پہلو کو غلط ثابت کرنے کے مشن پر پابہ رکاب اور میانِ دروں و بیروں، کبھی ہاں کبھی نہیں۔

تو جہاں گرد نے ایسے میں کمرے کے دریچوں کے شگافوں پر آنکھیں ٹکا دیں

[ع۱] وقت مقرر تک

ـــــــ وہ جاگ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا، شاید کہ متفکر تھا اور بے چین بھی۔

جہاں گرد نے آہستہ سے صفحات اُلٹ دیئے:

"...... جب بنو غیثات اور بنو بعلبک کے درمیان رشتۂ خون قائم ہوا تو قبیلے کے تمام افراد نے اس یک جائی کا جشن منایا کہ جشنِ وصال میں درد، مجبوری کے کم ہونے کا امکان تھا مگر بنو غیثات جو مشرق سے ہجرت کر کے بنو بعلبک کے شہروں میں داخل ہوئے تھے، اپنے احساسِ زیاں کے اختتام کے جویا تھے اور تب ایسے میں دیوارِ گریہ کی تجسیم نے سر اٹھایا جو اشئے اور لاشئے کے مابین قائم کی گئی۔ اور تب بنو بعلبک نے دیکھا کہ زمین سے رشتہ ختم کرنے والے بدلوں کی بنیاد پہ کاروبار کرنے لگے اور جنہوں نے کاروبار کے بیچ مرگ کا ہلکا سایہ وہ دیوارِ انسلاک بنا......"

اس نے ٹہلتے ٹہلتے پیمانات کے انبار پہ نظر کی اور جھلا گیا۔ آہستہ سے بڑبڑایا۔ "کاروباری اور تنظیمی نقطۂ نظر" اور زور سے چلایا "لے جاؤ، ہٹاؤ" خدام دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور زانوؤں کے بل جھک کر کھڑے ہو گئے۔ "لے جاؤ" وہ پھر چلایا جیسے سرسامی کیفیت طاری ہو۔ "میں کچھ نہیں دیکھنا چاہتا، کچھ نہیں سننا چاہتا"

خدام انبار لے کر غلام گردشوں سے دوڑتے ہوئے دور نکل گئے اور پھر سناٹا تخت پر براجمان ہو گیا۔

جہاں گرد آہستہ سے مسکرایا، پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔ پلکیں نم ہو گئی تھیں، شاید قانونِ مکافات کی کرچیاں آنکھوں میں گڑنے لگی تھیں۔

"...... بنو بعلبک، اقبالی نہیں استقبالی مجرم تھے، جن کا استقبال کیا گیا۔ وہ کلہاڑوں سے گھروں کی جڑیں کھودتے تھے اور ہاتھ کاٹ رہے تھے کہ بنو غیثات کے خیال میں اس ویران

قرئیے کی نئے سرے سے تعمیر کی ضرورت تھی اور دست بریدہ بنو بعلبک بنو غیشات کو دست دراز دراز والے بنو بعلبک سے زیادہ زیادہ خوبصورت لگ رہے تھے۔"

"جلدی چلو، چلو، وقت کا گھوڑا تیزی سے بھاگا چلا جا رہا ہے" جہاں گرد نے جلدی جلدی فاضل صفحات الٹ دیئے۔۔

"بنو بعلبک کے خیموں کی قناتیں پرانی ہونے لگیں اور بنو غیشات کے میدانوں میں جشن نوروز کی کیفیت نیرنگ۔ ساماں بنی۔ مشعلیں دف، رباب اور فنجان اپنے مقامات کی تبدیلی میں مصروف تھے اور مورخ نئی تاریخ لکھنے کی تیاری میں مصروف۔۔۔
قبیلوں کے مابین بیزاری کا عمل تیز تر ہوتا گیا۔ سازشیں یا تو مشرقی میدانوں میں تیار کی گئیں یا بنو غیشات اور بنو بعلبک کے بطون آماجگاہ بنے۔۔۔۔۔۔ جو بھی ہوا، بہر حال ہوا۔۔۔۔۔"

جہاں گرد نے پھر صفحات اُلٹ دیئے ——

"۔۔۔۔۔ طبل جنگ بجا اور بنو غیشات کے مکین ویسا ہی شکستہ اور اداس خیموں والے بعلبک نئی نئی قناتوں کا حصار بنا کر جُٹ گئے ۔۔۔۔۔"

جہاں گرد نے پھر وہ صفحہ اُلٹ دیا جس پر حریف وحلیف کے وہ سارے بیانات درج تھے جو کہنہ قناتوں والے بنو بعلبک کی نئی نئی قناتوں کے بارے میں تشکیک پیدا کر رہے تھے کہ یہ سب ممکن کیسے ہوا؟

"۔۔۔۔۔ پھر یوں ہوا کہ سازش کامیاب ہوئی اور بنو بعلبک اور بنو غیشات نے اس عہد کے ساتھ لباسِ ہجر پہن لیا کہ اس لباسِ ہجر سے وصال کا رشتہ منقطع نہیں کریں گے۔۔۔"

جہاں گرد نے بنو بعلبک کے احوال پر مشتمل صفحات سے صرفِ نظر کیا اور بنو غیشات

کے احوال پر قیام کیا، کہ بنو بعلبک کے رکوع و سجود اس کے درونِ ذات کرچیوں کی مثل تھے۔

"..... پھر یوں ہوا کہ بنو بعلبک کی مثل بنو غیثاث کے خیموں اور میدانوں میں بھی افراتفری کا سماں پیدا ہوا۔ اور ان دونوں قبیلوں سے پرے بنو ہبل میں جشنِ فتح مندی برپا تھا کہ بالآخر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئے اور تمناؤں نے حقیقت کا رنگ اختیار کیا....."

جہاں گردنے بہت سے صفحات پھر الٹ دیئے ——

"..... اور جب لاعشہ ابن قندیبار ابن شرجیلان کو ہستانی نے ایک پل کو بینسے بھرا پیالہ کنارے کیا اور خمار آلود آنکھیں کھولیں تو اصحاب کہف بازار میں حیران و سرگرداں تھے کہ دنیا بدل چکی تھی اور حلوائی کی دکان پر لگایا گیا شیرہ رنگ دکھا چکا تھا، درباری کاہنوں کو طلب کیا گیا اور ان کا متفقہ فیصلہ یہی تھا، کہ ستاروں کی چال گڑبڑا چکی ہے لہٰذا عیش و عشرت کے دن تمام ہوئے..... تب لاعشہ ابن قندیبار ابن شرجیلان کو ہستانی نے ذوالفقفان کنتمبو کو بلایا جو بیٹا تھا طاؤس ساسانی کا اور طاؤس ساسانی غوشان ماوراالنہری کی اولاد سے تھا اور غوشان ماوراالنہری لاعشہ ابن قندیبار ابن شرجیلان کو ہستانی کا ہم جد تھا، کہ دونوں بنو غیثاث کے ہم جد قبیلے بنو عزّیٰ کی دو مختلف شاخوں سے تعلق رکھتے تھے اور لاعشہ کو معلوم تھا کہ ذوالفقفان کنتمبو دعرصہ دراز سے بنو غیثاث کی سرداری کا تمنائی تھا، پس لاعشہ کی عین امیدوں کے مطابق

یہ ہوا کہ خبر ملتے ہی ذوالفقفان کنتمبور منزلوں پر منزلیں طے کرتا اور دنوں کا فاصلہ گھنٹوں میں کم کرتا ہوا ہزاروں میل دُور سے چل کر بنو غیشاث کے دارالحکومت شورستان پہنچا اور لاعشہ ابن قندیسیار بہزاد عجلت قبیلہ بنو غیشاث کی سرداری ذوالفقفان کنتمبور ابن طرطاوس ساسانی کے حوالے کر کے خود گوشہ نشیں ہو گیا۔ ذوالفقفان کنتمبور ابن طرطاوس ساسانی ایک زیرک اور چالاک حکمراں ثابت ہوا۔ حالاں کہ بنو بعلبک اور بنو غیشاث کے درمیان ہونے والے تصادم نے دونوں قبیلوں کو چور چور کر دیا تھا، مگر فرق یہ تھا کہ بنو بعلبک کے ساتھ بنو ہبل تھے جبکہ بنو غیشاث کی سرحدوں کے دونوں طرف حریف تھے اور دو طرف پہاڑ اور دریا۔ گویا بنو غیشاث بتیس دانتوں کے بیچ ایک زبان کی مانند تھے جس کو ہر شخص دبا دینا چاہتا تھا، مگر ذوالفقفان کنتمبور کا مکر کام آیا اور اس نے اپنی چرب زبانی سے دشمنوں کو بھی دوست بنا لیا۔ حد یہ ہے کہ خود بنو بعلبک اور بنو ہبل کو بھی بنو غیشاث کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑا۔ اور پھر یوں ہوا کہ چہار دانگ عالم میں ذوالفقفان کنتمبور کا نام روشن ہوا اور سب نے یہ جانا کہ اس عالم آب و گل میں ذوالفقفان کنتمبور نام کا بھی ایک زیرک اور روشن دماغ حکمراں ہے۔ بنو غیشاث کے مرد و زن بھی ذوالفقفان کنتمبور کے احسان مند تھے کہ اُس کم پڑھے لکھے قبیلے میں ذوالفقفان چند پڑھے لکھے لوگوں میں سب سے زیادہ ذہین اور فطین تھا۔ پھر ذوالفقفان

... جب اپنے قبیلے پر پوری طرح غالب ہو گیا تو اس نے سفید چمڑی والوں کے ملک سے حاصل کئے ہوئے ملک سے فائدہ اٹھانا پڑا اور قبیلے کے مختلف جرگوں نے اور ان کے مختلف جلسوں میں رائے عامہ کے فوائد پر تقریریں کیں اور رائے عامہ نے ڈانڈے شوروی نظام سے ملانے کی کوشش کی لیکن ذوالفقفان کنتمبو اور لاعشہ ابن قندیاد ابن ضرجیلان کوہستانی کا ہم جد ضرغام آفندی حسد کی آگ میں جھلس رہا تھا کہ ذوالفقفان کی بہ نسبت ضرغام آفندی لاعشہ کا زیادہ قریبی رشتہ دار تھا۔ مگر چونکہ لاعشہ جانتا تھا کہ قبیلے کی سپہ سالاری ایک الگ فن ہے اور قبیلے کی سرداری ایک الگ بات۔ اس لئے لاعشہ نے ضرغام آفندی کی بہ نسبت ذوالفقفان کو ترجیح دی کہ ذوالفقفان کنتمبو سپہ سالار ضرغام آفندی سے زیادہ حکمرانی کی صلاحیتیں رکھتا تھا، لیکن یونہیں کے ماہرین سیاست، سیاست کی شطرنجی بازی ہیں۔ تو ... کو اپنا دست نگر بنانے کے بعد اب یوغیناد کی نسل کو مات دینے کی فکر میں سرگرداں تھے اور تب اندر ہی اندر ایک گھمسان کا رن پڑا ---- سات سمندر پار سے پانچ دریاؤں کے ساحلی علاقوں تک حملے کے مقامات مقرر کئے گئے اور ذوالفقفان کنتمبو کو اس کی ... تقریریں یاد دلا کر شوروی نظام کے قیام کی درخواست کی گئی اور مطالبے کئے گئے اور جب رائے عامہ کے نتائج برآمد ہوئے تو معلوم ہوا کہ قبیلہ

بنو غیشات کی اکثریت نے دوبارہ ذو الفقفان کنتمبور کو اپنا سردار منتخب کر لیا ہے، اس خبر نے نہ صرف ضرغام آفندی کو بلکہ دوسرے جرگوں کے ان تمام سرداروں کو جو بنو غیشات کی سرداری کے امیدوار تھے مشتعل کر دیا اور پھر ایک دن بنو غیشات کے سپہ سالار ضرغام آفندی نے ذو الفقفان کنتمبور کی گردن پر ولایت سے لایا ہوا آتشیں اسلحہ رکھ کر سرداری سے دست بردار ہونے کا اعلان کرایا، اور ذو الفقفان کنتمبور کو تنگ و تار حصار زنداں کی شہریت عطا کی......"

جہاں گرد نے پھر بہت سے اوراق الٹ دیے اور صفحات کے اختتام پر ٹھہر گیا۔

"......جرگوں کے سرداروں کی عدالت نے ذو الفقفان پر سردار نقش تاب قصغوری کے قتل کا الزام عائد کیا اور ذو الفقفان کنتمبور پر حد شرعی نافذ کرنے کا فیصلہ کیا گیا......"

"لیکن اگر یہ حدِ شرعی ہے تو تم پر یہ چپ اور جھنجھلاہٹ کیوں طاری ہے بھائی ضرغام آفندی؟" جہاں گرد نے آہستہ سے کھڑکیوں سے پھر کمرے کے اندر جھانکا۔ مسلسل کئی راتوں سے یہ تماشا جاری ہے۔ ضرغام آفندی نیند کی مملکت کا بیگانہ شہری، پتہ نہیں کس کرب کا شکار ہے، کون سا خوف اس پر حاوی ہے کہ نہ ہاں کرتے بنتی ہے اور نہ نہیں کرتے!

......تب سمندر پار سے، دریاؤں کے سواحل، نینوا، فرات اور دجلہ کے کناروں سے شمال و جنوب کے شب تاب علاقوں تک کے قاصد ذو الفقفان کنتمبور کی جان بخشی کی درخواستیں لے کر آئے، مگر ضرغام آفندی نے درخواستوں کا سارا انبار خدام کے ذریعہ دریا برد کرا دیا۔

اور تب ایسے میں جہاں گرد ذو الفقفان کنتمبور کے لیے نم دیدہ بھی ہوا اور قانون مکافات پر مسکرایا بھی۔ شاید اسے بنو بعلبک کے فرشتے یاد آ گئے

تھے، یا بنو ہبل کے میدانوں میں رہنے والے جو بنو ہبل کے قبیلے سے تو نہ تھے مگر وہ اوپر جا کر منو شالح کے خاندان سے واقع ہوئے تھے اور منو شالح حنوک کی اولاد سے تھا اور حنوک یارد کی اور یارد مہلئی ایل کی اور مہلئی ایل قینان کی اور قینان انوش کی اور انوش شیث کی اور شیث آدم کی اور اس طرح بنو ہبل، بنو بعلبک اور بنو غیشات سب ایک ہی باپ آدم کی اولاد تھے۔ اور آدم نے جب خدا کی نافرمانی کی تو حکم ہوا (وقلنا) اھبطوا بعضکم لبعض عدوٌ و لکم فی الارض مستقرٌ و متاعٌ الی حین ٥ (اور کہا ہم نے آدم و حوا کو کہ) "نیچے اتر جاؤ اور تم میں سے بعض کا بعض دشمن ہوگا اور ہے تم لوگوں کے لئے زمین میں قرار پکڑنے کی جگہ" اور سرمایۂ زندگی وقت مقررہ تک"۔

تو اب بنو بعلبک، بنو غیشات، بنو ہبل ذوالفقعان کنتمبور ضرغام آفندی اور سردار نقش تابہ تصغودی سب ایک دوسرے کے لئے بعض کا بعض تھے، پس ایک دوسرے کے دشمن تھے اور بنو بعلبک کے میدانوں میں، بنو غیشات کے شہروں میں اور بنو ہبل کے قریوں میں ہر شخص ایک دوسرے کے لئے بعض کا بعض تھا اور اس لئے ایک دوسرے کا دشمن تھا، لہٰذا دشمن ضرغام آفندی نے دشمن ذوالفقعان کنتمبور کی بازی الٹ دی اور اب چہار دانگ عالم کے سیاست داں، انسانیت نواز اور شاعر سب کے سب ذوالفقعان کی جان بخشی کی درخواست کر رہے ہیں، لیکن جب ذوالفقعان کنتمبور بنو غیشات کی محفوظ سرحدوں میں بیٹھا بنو بعلبک اور بنو ہبل کے درمیان رہنے والوں کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کو قتل کرا رہا تھا تو سب چپ تھے کہ ان کی نظر میں یہ قبیلۂ بنو غیشات کا ذاتی معاملہ تھا اور پھر جب ذوالفقعان کی سرداری کے بعد نمبرداروں نے بنو غیشات کے ہر حریف جرگے کے ساتھ جو ایذا پسندانہ رویّہ اپنایا تو اس کی تو شاید خبر بھی سیاستدانوں، انسانیت نوازوں اور شاعروں کو نہیں پہنچ سکی ...... ہیہات ...... ہیہات ......

لیکن ان ہی سانحات میں سے ایک سانحہ سردار نقش تاب قصغوری کا تھا جس کے قتل کا راز اچانک طشت از بام ہو گیا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ ذوالفقفان کنتمبود اور اس کی باہمت اولادیں ضرغام آفندی سے معافی مانگنے سے صاف انکار کر رہی ہیں اور ضرغام آفندی شکست کے پرندوں کو اپنی منڈیروں کے ارد گرد اڑتے دیکھ کر بوکھلا رہا ہے اور بوکھلا بوکھلا کر اور زیادہ متشددانہ رویہ اپنا رہا ہے اور مورخ ایک مرتبہ پھر نئی تاریخ لکھنے کی تیاری کر رہا ہے۔

جہاں گرد نے پھر کتاب کھولی، الٹ پلٹ کر شروع سے آخر تک دیکھا، پھر بند کر دیا کہ فی الحال آگے کے صفحات سفید ہیں اور اندر کمرے میں ضرغام آفندی بے تابانہ ٹہل رہا ہے کہ اسے ذوالفقفان کی سرداری میں بھی چین نہیں تھا اور اس کے مکمل زوال سے بھی خوف زدہ ہے کہ دیوزاد جانشین "مکافاتِ عمل" کا سبق یاد کر رہے ہیں۔

جہاں گرد حضرت شیخ بوعلی ہجویریؒ کے روضے کی طرف متوجہ ہوا کہ شاید "استخارہ" کسی اشارے کا باعث بنے مگر وہاں بھی خاموشی تھی۔ بس ایک آواز گاہے گاہے ابھرتی پھر ڈوب جاتی .... بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین ...... و متاع الی حین .... و متاع الی حین .... آواز ابھر رہی ہے اور ذوالفقفان کنتمبود کی گردن پر آتشیں اسلحہ رکھ کر قبیلے کی سرداری حاصل کرنے والا ضرغام آفندی بے چینی سے ٹہل رہا ہے اور ذوالفقفان حصارِ زنداں میں اپنے اعمال کا محاسبہ کر رہا ہے ——

اور تب ایسے میں جہاں گرد پر "بعضکم لبعض عدو" کی ایک نئی تفسیر منکشف ہوتی ہے کہ جہاں ذوالفقفان کنتمبو اور ضرغام آفندی ایک دوسرے کے بعض کا بعض ہیں وہیں ذوالفقفان خود ذوالفقفان کا اور ضرغام آفندی خود ضرغام آفندی کا بعض کا بعض ہے لہٰذا دونوں اپنے دشمن

خود ہیں۔

"تو ضرغام آفندی" جہاں گرد آہستہ سے بڑبڑایا "تمہارے الزام کے مطابق ذوالفقفان تنتبود نے سردار نقش تاب قصغوری کو بیچ صحرا میں ٹھرمار کر مارا اگر شرعی عدالت کے نصف قاضیوں کی رائے میں چونکہ ذوالفقفان موقع واردات پر موجود نہیں تھا اس لئے حد شرعی کا سزاوار نہیں ہوتا۔ لیکن تم اس اختلاف رائے کے باوجود اسے قاتل گردانتے ہو" تو تم بے گواہاں پر رکھو گے ضرغام آفندی؟"

"میں لکھ دوں جہاں گرد؟" مورخ نے سر اٹھا کر پوچھا۔ تو جہاں گرد نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"ذرا اور ٹھہر جاؤ" جہاں گرد نے اس سے کہا "تم کیوں عجلت کر رہے ہو۔ ذوالفقفان تنتبود اور ضرغام آفندی اپنے لئے خود ہی بعض کا بعض ہیں اور خود ہی اپنے خلاف فیصلہ لکھنے میں مشغول ہیں ——"

مورخ نے قلم روک لیا لیکن قلم ہاتھ ہی میں ہے اور حضرت شیخ بوعلی ہجویری کے روضے سے لحن داؤدی میں تلاوت کی آواز آرہی ہے ...... بعضکم لبعض عدو و لکم فی الارض مستقر و متاع الی حین ...... و متاع الی حین ...... متاع الی حین!

دونوں وقت گلے مل رہے ہیں۔ جہاں گرد ٹھہر گیا ہے ...... مورخ نے ہاتھ روک لیا ہے۔ لیکن ہاتھ سے نہیں رکھا ہے کہ فیصلہ اب ہوا ہی چاہتا ہے ...... شاید صرف وقتِ مقررہ کا انتظار ہے۔

بلبلہ

تجھی پرتوں کو نہیں کھولنا چاہتا ہوں، تم میرے ساتھ کھولے ہوئے سمندر میں کود نے کے لیے تیار ہو؟"

"میں پہلے ہی سمجھتا تھا، کہ تم یہی جواب دو گے، لیکن تم نے کبھی یہ محسوس کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی، کہ ہم نے اپنا کچّا مکان شوقیہ مسمار نہیں کرایا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارے علاقے میں سیلاب کی پورشوں نے اپنی دکان سجا رکھی تھی۔"

اصل واقعہ یوں ہے کہ وہ میرے دونوں شانوں پہ آرام سے بیٹھا ہوا ہے، میں بارہا اس سے کہتا ہوں کہ میرے شانے دُکھ رہے ہیں اب اتر جاؤ، مگر اس اللہ کے بندے کے کان پہ جوں تک نہیں رینگ رہی ہے۔

"دیکھو! اب آگے بڑھنا ہے۔ اب تک تو ہم بلندیوں اور پستیوں کے درمیان گمبھیر محسوسات کو اپنے وجود کا ایک حصّہ بنا رہے تھے، مگر اب چڑھائی ہے۔ میں آبرو دو تک تمھیں نہیں ڈھو سکوں گا۔۔۔۔ اُتر جاؤ۔۔۔۔ پلیز اُتر جاؤ۔۔۔۔"

صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے کہ کوئی اَن دیکھا، اَن جانا اور اَن چھوا وجود
نہ جانے کہاں سے پورے وجود پہ کیڑوں کی طرح رینگنے لگتا ہے۔ لاکھ کوشش کیجیے، کہ
کسی طرح اس کو جھٹک دیں، مگر ران پہ ہاتھ ماریئے، تو کمر پہ سرسرانے لگتا ہے، کمر پہ
ہاتھ ماریئے تو سینے میں خارش ہونے لگتی ہے، سینے کو اپنی انگلیوں کا مرکز بنایئے تو ہونٹوں
پہ کچھ مچلنے لگتا ہے ....."

دیکھو! کھولتے ہوئے سمندر میں ان لوگوں نے اپنی بستیاں آباد کر رکھی ہیں، وہ
بڑے معصوم اور بھولے بھالے لوگ ہیں۔ انھوں نے اپنے یہاں سے سمتوں کا وجود ختم
کر دیا ہے اور سیاہ نقطوں کو ملبوں کا ڈھیر بنا کر اب اسی پہ انام ملوں کا گیت
گاتے ہیں ....."

"تم کہہ دو کہ میرے پتوار شکستہ ہیں اور میں اُن کے سہارے کھولتے سمندر میں
نہیں کود سکتا۔"

"پتوار کی ضرورت کسے ہے؟ ہم تو یہیں سے اپنے ہاتھ کاٹ لیں گے ....."

"ہاں! ہم خلاؤں پہ بھروسہ کرنے والے لوگ مٹی کے کھلونوں سے دل
نہیں بہلایا کرتے۔"

"ہم جنگلوں کے سفر میں کھوئے گئے مسافر ہیں، اس کی باتوں پہ یقین
کرو گے، تو رستوں کا سُراغ تو الگ ایک مسئلہ ہے، ہم خود اپنے آپ میں منزل
بن جائیں گے ....."

"میں تمھیں ایک کہانی سناتا ہوں، وہ دن کو دور دراز علاقوں کا سفر
کرتے تھے، اپنی باتیں دوسروں تک پہنچاتے تھے، پھر شام گئے واپس آتے تھے، تو ....."

"اے کمبل والے! کچھ آرام بھی کیا کیجیے!"

خلطِ مبحث مت کرو۔ زمین کے گول ہونے کی بات، زندگی کو دہرانے کا مسئلہ اور
عطر کی شیشی میں پاخانے کا کیڑا ..... سب بھول چکے ہو؟"

"اُف، کتنی دیر ہو گئی، وہاں لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کپڑا بدلے مجھے

گھنٹوں ہو گئے اور اب تک میں نے سر نہیں جھاڑا۔"

"تو میرے دونوں قدموں کے بیچ کی زمین..... اور میرے قدموں کے نیچے کی زمین..... اور میرے قدموں کے دائیں بائیں کی زمین....."

"خوشبو تو ہر طرف سے اُٹھتی ہے....."

"جنازے میں شرکت کرنا ایک سماجی خدمت ہے۔"

"امداد باہمی کا مسئلہ صرف لفظوں کی زنجیر نہیں، ہماری ایک نہایت اشد ضرورت ہے۔"

"دیکھو! اب اُتر جاؤ..... پلیز اُتر جاؤ..... میں واپس آکر پھر تمہیں گود میں لے لوں گا۔"

"تم باتوں کو ہوا میں اُڑا نہیں سکتے دوست... عطر کی شیشی میں پاخانے کا کیڑا....!"

"تم..... تم گدھے ہو..... تم کائر، کمینے، ظالم ہو۔ تم چاہتے ہو کہ دو ہاتھ دس ہاتھ کو کاٹ ڈالیں؟ تم چاہتے ہو کہ جمود حرکت پر حاوی ہو جائے؟ تم چاہتے ہو کہ ہم دور دراز علاقوں کا سفر کر کے لنکا جائیں اور آدم کے پیروں کے نشان کو اپنے ماتھے کی زینت بنائیں جسے وہاں کے لوگ کھرچ کھرچ کر مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

"میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا، میں بخی پرتوں کی تہیں کھولنا چاہتا ہوں.... میرے ساتھ کھیلتے سمندر میں کود دو!"

انکوائری... پولیس... تھانہ... جیل... سزا... (تھر تھر تھر تھر)

دیکھو! تم تو میرے دوست ہو نا؟ کسی کو اس کا پتہ نہیں ہے، بہت دنوں سے وہ قبرستان میں میرے لئے قبروں کا انتخاب کر رہا تھا۔ اس نے گورکن بھی بلوائے تھے..... بزنس میں یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ اتنے دنوں تک وہ مجھ پر حاوی تھا آج اس کو میرے کاندھوں کی ضرورت ہے... ہے نا؟

توشیم! میں تم سے جھوٹ نہیں بولتا، میرا یہ کمرہ اکثر میرے لئے قبر بن جاتا ہے۔ ہر چہار طرف سے منکر نکیر نکلنے لگتے ہیں۔ جنت، جہنم، اعراف، تمام مقامات کی کھڑکیاں

بیک وقت کھول دی جاتی ہیں، اور یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے، جب وہ مجھ سے کہتا ہے: "میں بھی پرتوں کی تہیں کھولنا چاہتا ہوں میرے ساتھ کھیلتے ہوئے سمندر میں کود و!" میں نے وادیوں کی نرم فضاؤں کا ذکر بھی سُنا ہے اور زمین کے گول ہونے کی بات بھی، میں یہ بھی جانتا ہوں، کہ وہ لوگ بڑے معصوم تھے، جن میں سے کوئی اپنے کمبل میں کانٹے لپیٹ لیٹتا تھا اور کوئی بستر پر نیابت کرتا تھا...

تلوار لے کر بپھرا ہوا انسان ..... "آج اُسے قتل ہی کر دوں گا ..... زندہ نہیں چھوڑوں گا اُسے ....."

مسئلہ تو پہلی ہی منزل سے آگے بڑھنے کا ہے۔

CONFESS کو واقعی برداشت کر لینا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں، اور اسی لئے میں ہمیشہ اپنے اردگرد سیسہ پلائی ہوئی دیوار کھڑی کئے رہتا ہوں۔

مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ بضد ہے کہ " میرے ساتھ کھیلتے ہوئے سمندر میں کودو!" جنازہ اب باہر نکل چکا ہوگا۔ لوگ یہی سوچیں گے کہ BUSINESS POINT OF VIEW سے اس کو خوشی ہوئی۔

"دیکھو! اب اُتر جاؤ، نہیں تو ٹھیک نہیں ہوگا ....."

وہ خاموشی سے میرے شانوں پر بیٹھا اپنی اُنگلی سے میرے سر کے بال میرے تالو میں گھسا تا رہا۔ وقت بہت ہو چکا تھا اور اب مجھ سے غصہ برداشت بھی نہیں ہو رہا تھا، اس لئے میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ دھم سے زمین پر آ کر گرا اور میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلا تو یاد آیا، کہ تالہ کمرے میں چھوٹ گیا ہے۔ جلدی سے پھر کمرے میں تالہ لینے لگا، تو وہ مجھے دیکھ کر قہقہہ لگانے لگا۔

"آؤ گے ..... پھر آؤ گے!"

میں نے اُسے حقارت کی نظر سے دیکھا اور تالہ لے کر باہر نکل آیا لیکن کمرہ بند کر رہا تھا تو خیال ہوا کہ کچھ چھوٹ گیا ہے۔ میں نے جلدی سے کمرہ کا تالہ کھولا اور اپنی چھوڑی ہوئی شے تلاش کرنے لگا۔ مگر سب کچھ میں لے چکا تھا۔ طما کیا؟

آؤ گے ..... پھر آؤ گے!" میں پھر جب کمرے سے نکل رہا تھا تو اس نے قہقہہ لگایا ..... میں پھر تالہ بند کرنے لگا تو یاد آیا کہ سب کچھ چھوٹ گیا ہے۔ ایک بار میں نے دروازے پر ہی کھڑے ہو کر پوری طرح اپنا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا سب کچھ میرے پاس موجود تھا، لیکن پھر بھی مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کچھ چھوٹ گیا ہے۔۔

میں بہت دیر تک دروازے پر کھڑا رہا ..... اپنی کھوئی شئے کے بارے میں یاد کرتا رہا اور وہ اندر سے قہقہہ لگاتا رہا۔ طبیعت پہ عجیب سی گرانی تھی، پھر بھی میں چل پڑا ..... لیکن ہر لمحہ مجھے احساس ہوتا رہا جیسے مجھ میں کوئی کمی ہے ..... جی چاہتا ہے کہ روؤں، مگر آنسوؤں کی کمک سورج کے سائے میں سانس لے رہی تھی۔

اور کسی کسی طرح میں جب واپس لوٹا۔ تو وہ دروازے پہ بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا، کہ میں اُس سے لپٹ پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا: "میں تم سے الگ ہو کر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا ..... میں مر جاؤں گا، مر جاؤں گا۔" میں نے سسکیوں میں کہا۔

وہ آہستہ آہستہ میری پیٹھ پر اپنے ہاتھ پھیرتا رہا، پھر میری گردن میں اُس نے اپنے دانت پیوست کر دیئے اور میرا خون پینے لگا۔

صحرا کا سورج

اور پھر یوں ہوا کہ وہ مر گیا ——

مجھے جھوٹ بولنا نہیں آتا ہے اور سچ کے لمس سے آج تک آگاہ نہیں ہو سکا ہوں اس لیے سچ اور جھوٹ سے ماوراء ہو کر میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کے مرنے سے نہ تو مجھے کوئی خوشی ہوئی اور نہ ہی کوئی دکھ۔ صرف ایک لمحہ کے لئے ذہن کے کسی گوشے سے ایک سوال نے سر اٹھایا کہ "گویا یہ بھی مر گیا؟" اس سوال کا کیا مطلب ہے، یہ سوال المیہ ہے یا طربیہ، مزاحیہ ہے یا سوالیہ، میں نہیں کہہ سکتا۔ میں تو صرف اتنی بات جانتا ہوں اور کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس کی لاش کو اپنے ذہن کے خانوں میں فٹ کر لیا اور اس کی آنکھیں اپنی آنکھوں پہ چسپاں کر کے اس کے گھر والوں کو اس کی موت کی اطلاع دینے چل پڑا۔

میں جب اس کے گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کے گھر والے جشن منانے

تھے اور خوشیوں مسرتوں اور شادمانیوں کی انگلیاں اپنی آنکھوں میں چبھوئے اندھے بنے بیٹھے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید ان لوگوں کو اس کی موت کی خبر نہیں ہے اور میں نے اس کی موت کا احساس دلانے کے لیئے ان کی خوشیوں، مسرتوں اور شادمانیوں کی انگلیاں ان کی آنکھوں سے نکالیں اور انھیں بتایا کہ "وہ جو ان کا اپنا تھا وہ آج مرچکا ہے" لیکن اس وقت میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، جب انھوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کیا اور میری طرف کچھ ایسی نظروں سے تکنے لگے جیسے میں پاگل ہوں۔

"بھئی آگے بڑھو، ہمارے جتنے اپنے ہیں وہ سب یہاں موجود ہیں"

ان میں سے ایک نے اُکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور نغمے پھر اُبل پڑے ...... یا ...... یا ...... ساکت پاؤں حرکت میں آچکے تھے اور خموشی کا سمندر چیخوں کی گنبد میں تبدیل ہوچکا تھا۔

میں چند لمحوں تک اس گھر کی دہلیز پر ساکت وجامد کھڑا رہا اور رہا کہ جب اس کو پہچاننے سے اس طرح انکار کر سکتے ہیں تو پھر میں کہاں کاش ڈھونڈتا رہوں گا، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ ممکن ہے میں ہی غلط سمجھ رہا ہوں اور حقیقت میں یہ لوگ اس کے اپنے نہ ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایک سوال یہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا، کہ اگر یہ لوگ اس کے اپنے نہیں ہیں تب پھر اور کون اپنا ہوسکتا ہے؟ میں نے انگلیوں پر گنا۔ اس بستی میں تقریباً سات آٹھ گھر تھے اور ہر گھر میں نشانی کے طور پر کوئی ایسی چیز استعمال کی جاتی تھی، جو انھیں دوسرے گھر سے ممتاز کرے۔ یہ گھر بستی کا سب سے پہلا گھر تھا اور پوری بستی میں اس گھر کے افراد کو سب سے زیادہ دولت، طاقت اور ہمّت والا سمجھا جاتا تھا، اور گویا اقتدار انھیں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ لوگ نشان کے طور پر ایسا ہیرٹ استعمال کرتے تھے جس کی سطح چوکور ہوتی تھی اور اس سطح پر ڈھیر سارے گڈھے اور گڑھیاں بھی رہتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو جنگلوں کے احساسات اور وادیوں کی پیاس کو اپنے وجود کا

ایک حصّہ بنا چکے تھے اور چوں کہ سب سے پہلے آئے تھے اس لئے شاہ راہوں پر نمایاں انداز میں ان ہی کا لہو جگمگا رہا تھا۔

اس گھر کے بعد جو گھر تھا اس گھر کے لوگ نشان کے طور پر اپنے سروں پر ایک سینگ لگایا کرتے تھے اور پھر اس کے بعد جو لوگ تھے، وہ گلے میں تلواریں، ڈھالیں، بھالے اور طوق و سلاسل لٹکائے پھرتے تھے اور شانوں پہ دار و رسن لادے رہتے تھے اور اسی طرح اور دوسرا گھرانہ بھی کوئی نہ کوئی نشانی ضرور رکھتا تھا۔

تو میں ـــــ ۔۔ کی لاش اپنے ذہن کے خانوں میں فٹ کئے، دور دراز کا سفر کر کے اس گھر تک پہنچا تھا، جب یہاں سے نا اُمید ہو گیا تو اگلے گھر کی نبڑھا ـــــ لیکن تعجب خیز اور سنسنی خیز باتیں شاید میرا مقدر ہیں ـــــ اس لئے کہ میں جیسے ہی اس گھر کی طرف بڑھا، اس گھر کے سارے چوہے اپنی اپنی بلوں گھس گئے، میں ان کو پکارتا پکارتا تھک گیا مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا اور تب گھُسنے والا ہی تھا، کہ ایک چوہا میری طرف دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا بہت عاجزانہ تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے سر دن پر سینگ ہیں لگائے تھے مگر مجھے اس کے "سینگی" ہونے کا یقین اس لئے ہو گیا کہ اس کا سینگ اس کے سینے میں گھُسا ہوا تھا اور سینے سے خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے مشورتاً اس سے کہا۔

"اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم سینگ اپنے سر پر لگا لو"

"مم..... مم..... میں..... میں 'سینگی' نہیں ہوں صاحب"

اس کے لہجے کی لکنت اس کے خوف کو ظاہر کر رہی تھی اور مجھے اس کے اس سفید جھوٹ پر بہت غصہ آیا، اور میں نے غصے ہی کی حالت میں اس کے دل کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ..... اوہ..... آہ ـــــ"

اس کے منہ سے کچھ عجیب سی آواز نکلی اور پھر وہ سرپٹ بھاگ نکلا۔ نہ

جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ لاش اِسی گھر کی ہو اور میں اس کا تعاقب کرتا ہوا اس کے آنگن تک پہنچ گیا مگر وہ اپنے بِل میں گھس چکا تھا اور باہر سناٹا مجھے آنکھیں دکھا رہا تھا لیکن میں نے سناٹے سے مرعوب ہوئے بغیر پکار کر کہا ۔۔۔

"تمھارے گھر کی ایک لاش ہے، کم از کم اسے تو لے لو۔"

صبح سے شام تک میں گھومتا رہا اور بستی کے ہر ہر گھر پہ دستک دیتا رہا۔ مگر ہر جگہ سے مجھے یہی جواب ملا "ہمارا کوئی نہیں مرا ...... ہم سب زندہ ہیں ......

ہم سب زندہ ہیں ...... "

میں تھک کر گاؤں سے باہر نکل آیا اور نہر کی طرف جاتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

"آخر یہ کس کی لاش ہے؟ ایسا کون ہے جس کا کوئی نہیں؟"

"سنو! اس نہر کو پار کر کے ایک کچی سڑک کے سہارے اس دریا تک جاؤ جس کا پھیلاؤ ریگستانی ساحلوں کے ساتھ صحبت کر کے بیلی کے منہ میں زہر بھر دیتا ہے اور پھر وہاں سے ہواؤں کے دوش پہ سفر کرتے ہوئے اس علاقے کو پار کرو جہاں کانٹوں کا گلشن ہے، آنسوؤں کی کیاری ہے اور لہو کی کھیتی ہوتی ہے اور اسی علاقہ کے بعد وہ علاقہ آتا ہے جہاں بانجھ عورتیں دودھ دیتی ہیں اور مائیں تخلیق کے کرب کے بعد بھی بچوں کو ریت کھلا کھلا کر مار ڈالتی ہیں اور وہیں اس لاش کے اپنے رہتے ہیں۔"

پگڈنڈی نے مجھے بتایا اور باوجودیکہ سفر بہت طویل اور کٹھن تھا لیکن میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے اس راستے پر چل پڑا۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس راستے میں مجھے کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کرنی پڑی ہوں گی لیکن میں بہ ہزار مشکل اس علاقے تک پہنچ ہی گیا اور ان لوگوں کے سامنے اس لاش کو رکھ دیا جسے میں ان لوگوں کی امانت سمجھ کر لایا تھا۔ میں نے جیسے ہی ان لوگوں کے سامنے اس لاش رکھی تو ویسے ہی مجھے معلوم ہوا جیسے سب کے سب

پھوٹ پھوٹ کر رو دیں گے لیکن اسی لمحہ کچھ لوگ آگے بڑھے اور انھوں نے چیخ کر کہا "یہ ہمارا کوئی نہیں ہے..... ہمارا کوئی نہیں مرا..... ہم سب زندہ ہیں"
اور پھر کچھ یوں ہوا کہ وہ سارے لوگ بھی جو رونے کی تیاری کر رہے تھے، اچانک چیخ پڑے "ہمارا کوئی نہیں مرا..... ہم سب زندہ ہیں..... ہم سب زندہ ہیں"
اس حادثے نے میرے رہے سہے حواس گم کر دیئے اور میں تھکے اور بوجھل قدموں سے جہاں سے آیا تھا، پھر اسی طرف لوٹ پڑا۔ میں کتنے قدموں چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا، کہ کیوں نہ میں اسی لاش سے پوچھوں کہ "خداوندا! تمہارے حواری کب تک تمہاری لاش اس طرح شانوں پر لئے دربدر مارے پھریں گے:..... اگر انھیں بھی موت آ گئی تو..... ؟؟"

میں واپسی میں جب "سر پہ گڑے سجانے والوں" اور "سینگ رکھنے والوں" کے گاؤں سے گذر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہر گھر سوگ میں ڈوبا ہوا تھا، نغمے تھم چکے تھے، تلوے ریت بن چکے تھے اور ہر گھر سے سسکیوں کے درمیان یہی سرگوشی ابھر رہی تھی "میرا بیٹا مر گیا..... میرا اپنا مر گیا" (اور شاید میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ جب میں دودھ دینے والی بانجھ عورتوں اور ریت کھلا کھلا کر اپنے بچوں کو مار ڈالنے والی ماؤں کے علاقے سے واپس ہو رہا تھا تو واپسی میں وہاں کے لوگوں کو بھی سسک سسک کر یہی کہتے سنا تھا..... "میرا بیٹا مر گیا..... میرا اپنا مر گیا" مجھے یہ سن کر یک گونہ سکون حاصل ہوا۔ اور میں نے سوچا کہ یہ دکھی ہیں اور ان کے دکھ میں کمی اسی طرح کی جا سکتی ہے کہ ان کو اُن کے اپنے کی لاش دے دی جائے، تاکہ کم از کم وہ اس کا مرا منہ تو دیکھ سکیں۔ مگر میں جیسے ہی اس ارادے سے پہلے گھر کی طرف بڑھا، تو ان کے ساکت پاؤں حرکت میں آ گئے..... یا..... یا..... یا..... نغمے پھر اُبلنے لگے۔
میں نے کئی بار پکار کر کہا "دیکھو! تمہارے اپنے کی لاش میں لے آیا ہوں اسے لے لو" مگر کسی نے بھی میری طرف توجہ نہ کی اور جب میں لاش لئے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگا تو سب بہ یک وقت چیخ پڑے "بھاگ جاؤ۔ ہمارا کوئی نہیں مرا..... ہم سب زندہ

ہیں..... ہم سب زندہ ہیں....." میں ان لوگوں کی وحشیانہ یورش اور شور و غل سے گھبرا کر بھاگ نکلا اور اگلے گھر کی طرف بڑھا لیکن میں نے جس جس گھر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی اُس گھر کے لوگ آنسو پونچھ پونچھ کر دوبارہ چیخنے لگے: "ہمارا کوئی نہیں مرا... ہم سب زندہ ہیں... ہم سب زندہ ہیں"

صبح سے شام تک میں گھومتا رہا بستی کے ایک ایک گھر کے دروازے پہ دستک دی اور ہر جگہ سے یہی جواب ملا اور جب میں تھک ہار کر گاؤں کی گلیاں پار کر کے کھیتوں تک پہنچا تو پھر مجھے ہر گھر سے سسکیوں کے درمیان یہی سرگوشی اور گونج سنائی دی "میرا بیٹا مر گیا... میرا اپنا مر گیا۔"

میں بوجھل قدموں سے نہر کی طرف چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آخر کون سی ایسی وجہ تھی، کہ انھوں نے میری بات پہ یقین نہیں کیا اور مجھے اپنے دُکھ درد کا ساتھی نہیں بنایا ——— کسی نے مجھ سے نفرت کی... کسی نے خوف کھایا... اور کسی نے مذاق اُڑایا... کیوں... آخر کیوں؟ اور سوچتے سوچتے اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے چلتے وقت اپنے لباس کے بائیں طرف والی جیب سے وہ سیاہ گولہ تو نکالا ہی نہیں تھا جو وقتاً فوقتاً صرف اپنے فائدے کے لئے میں اپنے پاس رکھا کرتا ہوں اور جس کی موجودگی ہمیشہ میرے چہرے پہ اندھی راتوں کے بدنما نقوش ثبت کر دیتی ہے۔

اور تب مجھے احساس ہوا کہ غلطی تو میری ہی ہے ——— یہ لوگ تو معصوم ہیں ——— !

سباویراں

(۲۵ مارچ ۱۹۷۹ء کی شب میں)

بڑا کمرہ :

"مٹھو! بی جی روزی بھیجو ..... مٹھو! بی جی روزی بھیجو۔" بڑی بڑی مونچھوں والا چابک لہرا کر کہتا ہے۔ "مٹھو! بی جی روزی بھیجو۔" زیادہ تر لوگ ایک مہیب ہم آہنگی کے ساتھ کہتے ہیں، دو چار چپ رہ جاتے ہیں تو شراب شراب چابک برسنے لگتا ہے۔ "بول حرامزادے بول"۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے اور سب لوگ جلدی جلدی بولنے لگتے ہیں۔ "مٹھو! بی جی روزی بھیجو ....."

چھوٹا کمرہ :

سیلن اور بدبو سے بھرپور، تعفن سے دماغ پراگندہ، اندھیرا، مچھر، کھٹمل، ایک جھلنگا چارپائی۔ ایک شخص ..... صرف ایک شخص!

آہستہ آہستہ گنگناتا ہے۔ ع ..... کوئی راہ میں جچا ہی نہیں ....."

آہستہ سے اٹھ کر کھڑکی کھولتا ہے، چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا، ہوائیں نہیں بلکہ ہواؤں کے تھپیڑے فضاؤں میں سرپٹخ رہے ہیں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس اندھیرے میں نہ جانے کیا تلاش کر رہا ہے، جب کچھ نہیں مل پاتا تو کھڑکی پہ سر ٹیک کر آہستہ سے بڑبڑاتا ہے "نیکی کی دولہن کہاں کھو گئی سید احمد؟ "میں رحم کی دولہن ہوں۔ مجھے اپناؤ گے؟ اندھیروں سے ایک شبیہہ

ابھر کر دریچے پر آ ٹھہرتی ہے اور وہ جلدی سے دریچہ بند کر دیتا ہے۔

بڑا آنگن :

خلقت کا اژدہام، سب اپنے اپنے کام میں مشغول، کوئی کرسیاں بھار رہا ہے، کوئی چکی چلا رہا ہے، کسی کے ہاتھ ریڈیو بنانے میں مصروف، کسی کی زبان نماز پڑھانے میں مشغول، کچھ لوگ کھیت جوت رہے ہیں، بعض فائلوں پر جھکے ہوئے ہیں، وغیرہ وغیرہ ....."

کام کرتے کرتے کبھی کوئی سر اٹھا کر چھوٹے کمرے کی طرف دیکھتا ہے مگر عین اسی لمحہ بڑے کمرے سے ٹھڑاپ ٹھڑاپ کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں اور پھر کورس کی آواز سنائی دیتی ہے "منٹھونیی جی روزی بھیجو ..... منٹھونیی جی روزی بھیجو"۔ اور دیکھنے والا جلدی سے سر جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک دوسرے سے آہستہ سے پوچھتا ہے۔ "کیا ہوا؟" اور جواب ملنے سے پہلے ٹھڑاپ ٹھڑاپ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، ذرا سی لمحہ منادی کرنے والا منادی کرتا گذر جاتا ہے ....."

ملک خدا کا ..... حکم رسول کا ..... چابک بادشاہ کا ....."

اور پھر جلدی سے سوال کرنے والا خود بدک کر جواب دینے والے سے دور بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

دریچہ چھوٹے کمرے کے چاروں طرف اندھیرا، گہرا سفاک اندھیرا صرف دریچے پر کسی پرچھائیں کی چھٹ پٹاہٹ کا گمان، جیسے کوئی فاختہ یا تیتر پھڑ پھڑا رہا ہو، مگر اس چھٹ پٹاہٹ میں بھی تڑپتی چھٹ پٹاتی پرچھائیں کا سر ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اور ان سب سے پرے :

کہیں دور ..... بہت دور کا سفر طے کرتی ہوئی ..... ایک کمزور آواز کی گونج ....."

ع اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ پے آئے ——— ؟؟؟

نام حسین الحق

تاریخی نام وصی بخت رسا

قلمی نام حسین الحق

والد کا نام جناب مولانا حافظ سید شاہ انوار الحق شہودی (تابش سہسرامی)

خاندان قطبی (مراد: حضرت امیر کبیر سید قطب الدین مدنی کڑوی مانک پوری)

مسلک تفضیلی

جدی وطن آنڈاری (بلیا - یوپی)

آبائی وطن شاہ ہارون سہسرام (بہار)

تاریخ پیدائش ۱۰ محرم الحرام بمطابق ۲ نومبر ۱۹۴۹ء

جائے پیدائش ہیپی ولا - محلہ املی آدم خاں سہسرام
(بدولت کدہ جناب خیر الدین احمد ترمذی مرحوم - المتخلص بہ خیر سہسرامی)

تعلیم مولوی (مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام)
بی - اے (آنرس) فرسٹ کلاس فرسٹ (ایس پی جین کالج سہسرام)
ایم - اے (اردو) فرسٹ کلاس فرسٹ (پٹنہ یونیورسٹی - پٹنہ)
ایم - اے (فارسی) فرسٹ کلاس سیکنڈ (مگدھ یونیورسٹی - گیا)

ذریعہ معاش معلمی (شعبۂ اردو گیا کالج - گیا)

پہلی کہانی "کتاب کھو گئی" (۱۹۵۸ء)

پہلی مطبوعہ کہانی "عزت کا انتقال" "کلیاں" لکھنؤ ۱۹۶۳ء میں متوفی بلیاوی کے نام

پہلا افسانہ "جدائی کا زہر" (۱۹۶۳ء)

پہلا مطبوعہ افسانہ "جیسے کو تیسا" (تیج ویکلی) دہلی ۱۹۶۶ء

شوق کبھی بہت کچھ - کبھی کچھ بھی نہیں

تمنا ایسی جو پوری نہیں ہوگی ...... ایسی جس کا ذکر ممکن نہیں۔

وفات کسی بھی محرم کی نو تاریخ کی شب (کاش!)

... ممکن ہے میں نے نظریاتی سچائی کو غلط سمجھا ہو ... (لیکن) میں نے ایک خواب عرفان کی تلاش میں زندگی گذاری ہے، یہ خواب ذاتی بھی ہے اور سماجی بھی، ذاتی یہ ہے کہ اُن چیزوں سے محبت کی جائے جو اشرافی (NOBLE) ہیں، جو خوب صورت ہیں اور نرم و نازک طور طریقوں والی ہیں، اور یہ کہ عرفان و وجدان کے لمحات کو اس بات کا موقع ہو کہ وہ دنیاوی معاملات میں بھی ہم کو عقل و فہم بخشیں، سماجی یہ ہے کہ چشمِ تخیل سے اُس دنیا کو دیکھا جائے جو ابھی خلق نہیں ہوئی ہے، ایسی دنیا جس میں افراد آزادانہ طور پر پلتے بڑھتے ہیں، جہاں نفرت، لالچ اور حسد اپنی موت آپ مرجاتے ہیں کیوں کہ اُنھیں غذا نہیں ملتی ... میں اُن چیزوں میں ایمان رکھتا ہوں اور دُنیا اپنی تمام نفرت انگیزیوں اور خوں ریزیوں کے باوجود میرے ایمان کو متزلزل نہیں کرسکی ہے ...

——— (برٹنڈ رسل)